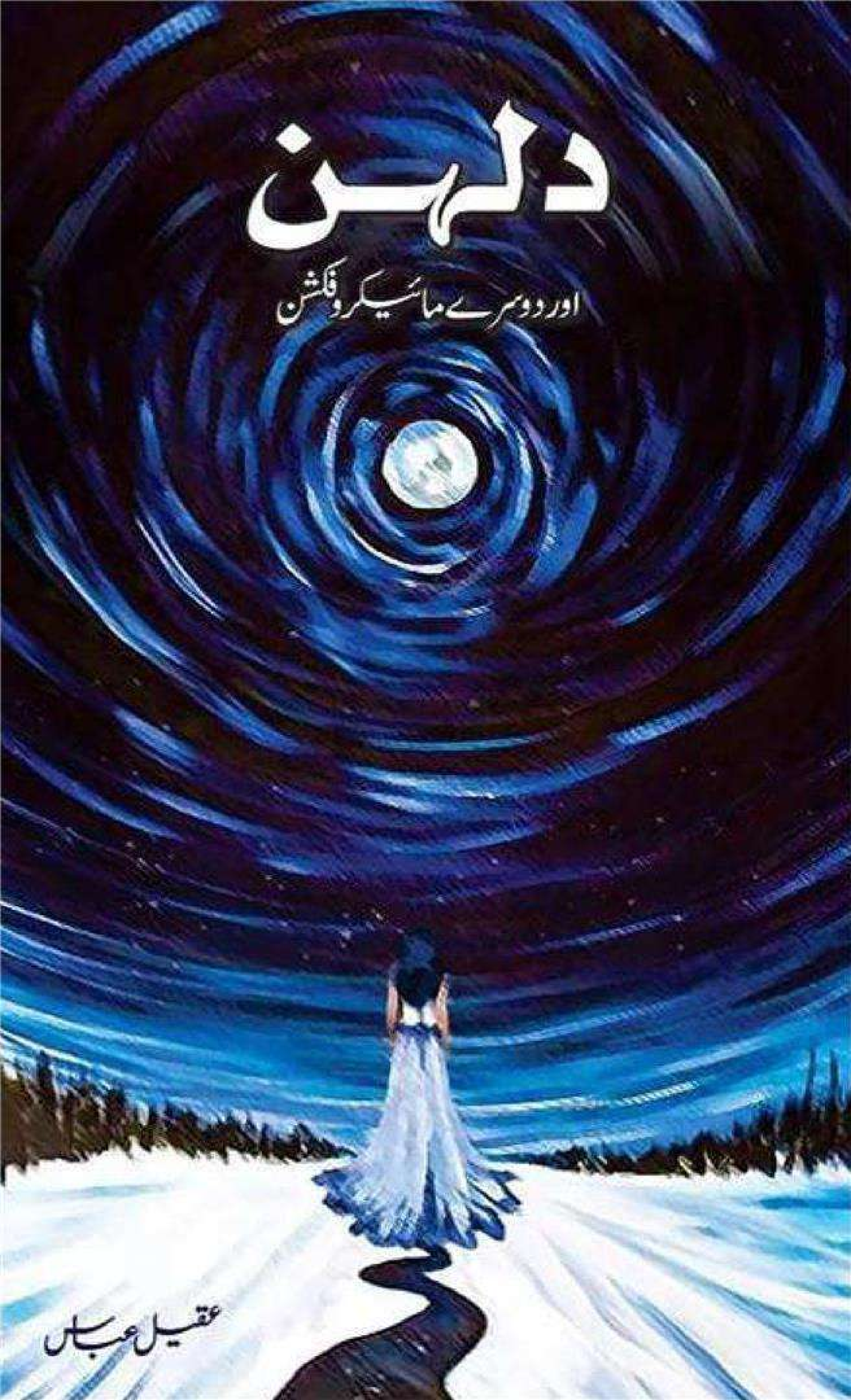
دلہن

اور دوسرے مائیکرو فکشن



عقیل عباس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دلہن اور دوسرے مائیکروفکشن

عقیل عباس

تم کیا جانو ہم کون میاں
ہم میر و غالب ، جون میاں
عقیل عباس

دلہن
اور دوسرے مائیکروفکشن

(مائیکروفکشن)

عقیل عباس

نظمینہ پبلیکشنز لاہور

ناشر
پبلی کیشنز نظمینہ لاہور

اہتمام واشاعت

زعیم رشید

0333-4919950 نام کتاب :دلہن اور دوسرے مائیکروفکشن

مصنف:عقیل عباس

0300-3372575

rjaqeelabbas@gmail.com

موضوع:مائیکروفکشن

میڈیاپارٹنر:سٹی سرکل بوریوالا

انتظام:ادبی تنظیم نظمینہ

کمپیوٹرکمپوزنگ:رحمت گرافکس

سرورق:ڈیزائن ہاؤس

سن اشاعت:2016

قیمت:300 روپے

ناشر:نظمینہ۔لاہور

فہرست

<><><><>

انتساب

اس بزرگ و برتر ہستی کے نام
جو ہر متھ اور فکشن سے
ماورا ہے اور جس کا کوئی ہمسر
نہیں۔

اظہارِ تشکر

عہدِ جدید کے نبض آشنا شاعر و ادیب

زعیم رشید

کی محبتوں کا مقروض ہوں

مائیکروفکشن اور عقیل عباس

ادب سرحدوں کی قید سے آزاد ہوتا ہے تاہم علاقائی حوالوں سے ہر خطے کے ادب کی الگ پہچان ہے ہر علاقے کا ادب اس معاشرے کی پہچان کرواتا ہے ہر خطے کا مزاج اور معاملات مختلف ہوتے ہیں اسی حوالے سے مختلف اصناف ادب میں پنپتی ہیں لیکن آج کے گلوبل ویلج میں یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔سرد علاقوں کے باسیوں کا مزاج، رہن سہن، سوچنے کا طریقہ کار اور معاملاتِ زندگی گرم علاقوں میں بسنے والوں سے مختلف ہیں۔ جو خطے قدرتی طور پر کچھ خاصیتوں اور محرومیوں کا شکار رہے اس کے اثرات وہاں بسنے والی قوم کے انداز اور اطوار پر مرتسم ہوئے اور ادب کا حصہ بھی بنے۔ کہیں سائنس و عقلی علوم نے انسان کو قوتِ اعتماد دی تو دوسری جانب ادب، سریت پسندی اور دینیات نے فروغ پایا۔ معلوم تاریخ میں ہیروڈوٹس پہلا مفکر ہے جس نے مشرق ومغرب کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے ایرانیوں اور یونانیوں کی باہمی چپقلش کو مشرق اور مغرب کی باہمی رقابت کی صورت پیش کیا۔ بعد کے یونانی مفکروں نے مغربی روح کے تصور کو اور نمایاں کر کے مشرق کے خلاف زیادہ فعال بنایا۔ مغربی یورشیں شروع ہوئیں تو دفاعی حکمت عملی کے تحت مشرقیت کے تصور نے فروغ پایا۔ دفاع کے لئے بادشاہت قائم ہوئی، بارود تیار کیا گیا، کاغذ کی

ایجاد سے اشاعتی سرگرمیوں کا آغاز ہوا،صفر کی ایجاد ہوئی ،سیاسیات اور فلسفہ نے جنم لیا،علم جنسیات کی مبادیات پر کام ہوا۔ میکاوٗلی کی دی پرنس سے صدیوں پہلے چانکیہ کی ارتھ شاستر لکھی جا چکی تھی ۔دیگر خطوں کی تہذیبوں میں بھی تصادم کی فضا رہی ہے تاہم ایسے میں ادب پنپتا رہا، ہر خطے میں ادب کئی کروٹیں لیتا رہا۔نئی زبانیں بھی وجود میں آئیں اور قدیم زبانوں نے بھی اپنا مزاج بدلا۔کبھی علمی بنیاد پر ادب میں فنی تجربات ہوئے کبھی مختلف تحریکیں ادب میں در آئیں۔ ان کے اثرات کئی زبانوں میں منتقل ہوئے۔ادب نے کلاسیکل دور سے گزر کر جدیدیت /لامرکزیت / ساختیات / نو مارکسیت /Hyper Reality /Deconstruction/ بین المتونیت /ہائی ماڈرن ازم /پوسٹ ماڈرن ازم کی کروٹ بھی لی۔ادب میں آج دیگر زبانوں کے ادب سے ادبی اصناف کا لین دین معمولی بات ہے۔اردو زبان کا دامن اس حوالے سے بہت وسعت رکھتا ہے ۔ شاعری ہو یا فکشن،اردو ادب نے مختلف زبانوں سے استفادہ کیا۔ناول/ناولٹ/افسانہ/ نظم/ہائیکو..... غزل بھی اردو زبان میں آئی۔

مائیکروفکشن انگریزی زبان سے براہ راست اردو زبان میں آیا اور بہت حد تک قبولیت حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہا۔

کھوج کاروں کے مطابق مائیکروفکشن کا ظہور لاطینی امریکہ میں بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا جہاں سے یہ مغربی یورپ پہنچ گیا اور آخری دہائیوں میں شام اور عراق تک پہنچ چکا تھا،مراکش الجزائر اور تیونس میں اسے

پذیرائی ملی، امریکیوں نے اسے فلیش فکشن کا نام دیا، جاپانیوں نے اسے ہتھیلی سائز کی کہانی کہا، چین میں اسے منٹ لانگ، سموک لانگ یا سگریٹ نوشی ٹائم کہانی بھی کہا گیا، کچھ لکھاریوں نے اسے پوپ کہانی سمجھا، کبھی اسے مختصر ترین افسانہ یا مائیکروسٹوری کہا گیا کہیں پورٹریٹ ادب کا نام دیا گیا تو کہیں ٹیلیگراف سٹوری کے نام سے پکارا گیا، تاہم مائیکروفکشن مغرب کے کئی معروف لکھاریوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔عربی روایتی افسانہ بھی اس کی چھیڑ چھاڑ سے محفوظ نہ رہا۔ محمد ابراہیم بو علو، احمد زیادے، احمد بوزفور، محمد زفراف، محمد تنفو، حسن برطال اور دیگر کئی لکھاریوں نے اس کے ارتقاء کے لئے راہ ہموار کی۔

عالمی ادب کا مطالعہ کریں تو جاپان میں مختصر ترین فکشن کی روایت سب سے پرانی دکھائی دیتی ہے۔سترھویں صدی میں نثر اور ہائیکو کو یکجا کر کے ہیبون لکھے گئے۔اس صنف میں بھی تبدیلی آئی اور ٹیکسٹ میسج تک محدود مختصر ترین کہانیاں بھی لکھی جانے لگیں جنہیں کیٹا فکشن کہتے ہیں۔رفتہ رفتہ بیسویں صدی کے آخر میں تھمب ناولز یا موبائل فون فکشن نے لے لی۔

میرا مائیکروفکشن سے پہلا تعارف برطانیہ میں قیام کے دوران ہوا جب میری مادر علمی یونیورسٹی آف لندن میں اس حوالے سے ایک تقریب منعقد ہوئی۔ برطانیہ میں قومی سطح پر بھی فلیش فکشن ڈے منایا جاتا ہے، وہاں تو SMS فکشن پر بھی کام ہو رہا ہے۔جیسے آج کی نئی جنریشن ٹوئٹر لیٹ کو بھی فکشن کی ایک صورت قرار دے رہی ہے اور اب نینو فکشن پر مباحث جاری ہیں۔

2004 سے امریکہ میں بھی مائیکروفکشن کے باقاعدہ مقابلے ہو رہے ہیں تاہم دیگر کئی ادبی اصناف کی طرح اس کی بھی کوئی لگی بندھی واضح تعریف سامنے نہیں آسکی۔ اردو کے کچھ لکھاریوں نے اسے مائیکروف کا نام دیا، الفاظ کی تعداد میں اسے قید کرنے کی سعی کی گئی کہ مائیکروفکشن 300 الفاظ سے تجاوز نہیں کرسکتا جبکہ فلیش فکشن 300 سے ایک ہزار الفاظ تک مشتمل ہوتا ہے۔ کچھ فیس بک کے فورمز پر کم از کم الفاظ 300 مقرر ہوئے۔ جیسے الفاظ کے شمار کے مطابق ناول، ناولہ، ناولٹ، افسانہ اور پھر افسانچہ۔۔۔۔۔ عمومی تاثر یہ ہے کہ افسانہ ساڑھے تین ہزار الفاظ سے ساڑھے سات ہزار الفاظ تک ہوتا ہے۔ فلیش فکشن پانچ سو سے ہزار بارہ سو الفاظ تک ہوتا ہے۔ مائیکروفکشن میں پانچ سو سے کم الفاظ ہوتے ہیں جبکہ ٹوئٹرلٹ کو پچیس الفاظ سے ایک سو چالیس حروف تک لکھا جاتا ہے۔ نینو فکشن اس سے بھی چند الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ کہانی کی لمبائی، قسم اور حجم کیا ہے قاری کو اچھی کہانی پڑھنے سے غرض ہوتی ہے۔ عمومی خیال یہ بھی ہے کہ آرٹ کا کوئی فارمولا نہیں ہوتا، کوئی پراپر فارمیٹ نہیں ہوتا، افسانہ کہانی کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ کہانی اور افسانے کو علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، کہانی کے طویل پیرائے میں کی جانے والی بات افسانے کی ایک لائن میں بھی سما سکتی ہے اس لئے یہ چیزیں کوئی الگ نہیں ہیں۔ یہ کلیریکل تفریق عام طور پر گرائمر کے لوگوں نے کی ہے۔ تخلیق کا آدمی تو اسے علیحدہ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ انتظار حسین اور ڈاکٹر انور سجاد نے ستر کی دھائی میں کہانی اور افسانے کی بحث

چھڑی۔ان مباحث کے بعد یہ روایت عام ہوتی چلی گئی اور دیگرنئی اصناف بارے بھی بہت سے علمی مباحث سامنے آئے۔آج مائیکروفکشن کو دیگر اصناف سے الگ کرنے کی بحث جاری ہے۔

مائیکروفکشن کی اہم خوبی اس کی تجرید ہے۔اس کی جڑت اساطیری واقعات سے بھی ہوسکتی ہے۔تخلیق کے پہناوے میں مذہبی قصائص بھی تجریدی ملاوٹ کے ساتھ مائیکروفکشن میں ڈھالے جارہے ہیں۔معروف مائیکروفکشن رائٹر Antonya Nelson کے مطابق مائیکروفکشن لکھنانہیں دکھانا ہے۔ تاہم اردوادب میں مائیکروفکشن پرکام کرنے والوں کے مطابق یہ ضروری ہے کہ نئے تجربات کے ساتھ رمزی مقصدیت کا وجوداشارہ وتلمیح کے استعمال سے ایک خفی پیغام کی صورت مختصر بیانیہ میں سامنے آئے۔ایسے مختصر جملے استعمال ہوں جو حرکت،سچوایشن اور واقعات کی کمپلی کیشن سے لبریز ہوں۔میرے خیال میں الفاظ کی شرط کی بجائے غیرضروری الفاظ سے اجتناب کرتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں قاری کومتاثر کرنا ہی کامیاب مائیکروفکشن کی ضمانت ہے۔محض کہانی میں کم الفاظ کا استعمال نہیں بلکہ کم الفاظ میں مکمل کہانی کہنے کافن مائیکروفکشن ہے۔بحرکیف مائیکروفکشن کی مثال چھوٹے ڈبہ میں بڑا مزہ جیسی ہے۔مائیکرو فکشن میں پنچ لائن کولازمی قرارنہیں دیا جاتا۔تحریر کا اصل مقصد قاری پرایک تاثر چھوڑنا ہے۔مائیکروفکشن کے حوالے سے بہت سے سوالات ابھی اٹھائے جا رہے ہیں۔جدید طرز احساس کے حامل نقاد اس نئ صنف پر گفتگو کرتے ہوئے

دکھائی دے رہے ہیں تاہم انگلیاں اٹھانے والوں کی بھی کمی نہیں اور اس صنف میں بھرپور کام کرنے والوں کے حوصلے بھی جواں نظر آتے ہیں۔

انسان جوں جوں ترقی کے ذینے طے کرتا گیا اس کا وقت قیمتی ہوتا گیا اور ذہن مصروف، تیزی سے بدلتی دنیا میں آج وقت کی شدید قلت کا سامنا ہے۔جدید دور میں ادب میں بھی کئی تبدیلیاں نظر آئیں مائیکروفکشن ایسی ہی ایک تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانے کی ایک مکمل فضا کو علامت کی پیوند کاری کا سہارا لیتے ہوئے کم سے کم الفاظ کا پہناوا پہنانا مائیکروفکشن ہے۔یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر افسانچہ کیا ہے؟افسانچہ کے ہوتے ہوئے مائیکروفکشن کیوں؟

افسانچہ اپنے نام اور ہیئت کے اعتبار سے افسانے کی تصغیری شکل ہی تو ہے۔آج کہانی میں جدت کی بات ہو رہی ہے میں سمجھتا ہوں ہر جدید طرز احساس اپنے عہد سے جڑا ہوتا ہے۔افسانچہ ہو یا مائیکروفکشن، دونوں میں کچھ قدریں مشترک بھی ہیں اور ان کے درمیان تمیز کرنے کے لئے مکمل طور پر جدلیاتی طریقہ نہیں اپنایا جا سکتا۔افسانچہ میں الفاظ کی تعداد کے تعین میں کافی گنجائش ہے جبکہ مائیکروفکشن میں ایسا نہیں (اس پر ابھی مباحث جاری ہیں)۔فلیش فکشن اور ٹوئٹرلٹ کے درمیان مائیکروفکشن ہے،ٹوئٹرلٹ اندازاً 25 الفاظ تک ہوتا ہے اور فلیش فکشن 500 الفاظ سے شروع ہوتا ہے تو ان کے درمیان ہی مائیکروفکشن کی تعداد کا تعین ہوگا۔الفاظ کی تعداد کے بعد بحوالہ متن بھی اسے دوسری اصناف سے

مختلف ہونا چاہئے۔جب مختصر تحریر لکھنے کا رواج عام ہوا تو اسے بغیر کسی اصول و ضوابط کے لکھا جانے لگا جس سے کئی اہم ادبی اصناف متاثر ہونے لگیں، اسی لئے ان اصناف کو ہیئت کے حوالے سے الگ الگ خانوں میں دیکھا جانے لگا اور ان کے اصول وضوابط طے پائے۔مائیکروفکشن کا متن اسے دوسری اصناف سے مختلف بناتا ہے۔انہماک کے مباحث میں یہ بات سامنے آئی کہ مائیکروفکشن کا جنم نثری نظم کے اختلاط سے ہوا۔اس لئے کبھی یہ نثری نظم کے روپ میں بھی نظر آتے ہیں اور کبھی افسانے کا پیرایہ اوڑھتے ہیں۔جب نظم میں نثر کی ملاوٹ ہو تو مائیکروفکشن جنم لیتے ہیں۔ہر مختصر قصہ اور کہانی مائیکروفکشن نہیں اور نہ ہی لطائف اس ضمن میں آتے ہیں۔ملانصیرالدین کے لطیفے مائیکروفکشن نہیں۔کچھ احباب منٹو کی سیاہ حاشیے کو بھی مائیکروفکشن سے تعبیر کر رہے ہیں۔راست بیانیہ میں تحریر کی گئیں مبشر زیدی کی 100 لفظوں کی کچھ کہانیاں مائیکروفکشن کی عمدہ مثال ہیں۔

آج تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی زندگی میں ایک ایک لمحہ انتشار سے بھرا ہے،ایسے میں فکر اور اقدار کے ذاویے تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں وہ چاہے اخلاقی ہوں یا ادبی۔ایسے میں ہم تخلیق کار سے یہ امید کیوں رکھیں کہ وہ انہی اصول وضوابط کا کاربند رہے جو مدتوں پہلے شعروادب کے سلسلہ میں اساتذہ سخن نے مرتب کئے تھے۔تخلیق کار بھی اسی نظام کا حصہ ہے۔ہم ذہن کے دریچوں کو کیوں بند رکھیں۔تازہ ہواؤں کے جھونکے کیوں نہ آنے دیں۔اپنے عہد کی ادبی ضرورتوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ اظہار و بیان کے نئے امکانات

وجہات کی تلاش وجستجو ادیب کا حق ہے۔

ڈی ایچ لارنس ایک جگہ لکھتا ہے کسی نئی آواز کو سننا مشکل ہے اتنا ہی مشکل جتنا کہ کسی انجانی بولی کو سننا اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ دنیا ڈر کے مارے نئی آواز کو نہیں سنتی، کیونکہ دنیا اگر کسی بات سے ڈرتی ہے تو وہ ہے نیا تجربہ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک نیا تجربہ بہت سے پرانے تجربات کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

مائیکروفکشن اب تشکیل کے مراحل میں نہیں بلکہ اس کے خدوخال بہت حد تک واضح ہو چکے ہیں۔اس کی اپنی ادبی شناخت قائم ہو چکی ہے۔اس میں وسیع تر تخلیقی امکانات پائے جاتے ہیں۔اس میں ایک تازہ جھونکے جیسا کیف ہے۔آنے والا عہد مائیکروفکشن کا ہی ہوگا اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ آنے والے زمانے میں بڑے اور اہم ادب کی مثال مائیکروفکشن کی ہی صورت میں نظر آئے۔اس کی راہیں بے حد تابناک اور روشن ہیں۔صدیوں پرانی بات اس پر صادق آتی ہے کہ عقلمند آدمی وہ ہے جو مختصر لفظوں میں بڑی بات کہہ دے،لیکن بڑی بات چند لفظوں میں بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں،اس کے لئے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے تب کہیں جا کر یہ ہنر ہاتھ لگتا ہے۔بدھا نے کہا تھا دنیا میں ہر چیز تبدیل ہو جائے گی سوائے تبدیلی کے۔۔۔ادب میں آج بھی زیادہ تر لوگ لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ہم نہ خود کچھ نیا کرنا چاہتے ہیں نہ لوگوں کو نیا کرنے کی اجازت دیتے ہیں یہ رویہ ہر دور میں رہا لیکن دیوانے اپنے لئے راہ

نکال ہی لیتے ہیں۔

عقیل عباس بنیادی طور پر ایک شاعر ہے جب فکشن کی طرف اس کا رجحان بڑھا تو یہ مائیکروفکشن کے قریب بھی اسی لئے ہوا کہ اس میں شاعری کی چاشنی موجود ہے۔ہم ادبی تنظیم نظمینہ کومل کر چلا رہے ہیں، عقیل عباس نظمینہ کا بہت ایکٹو جنرل سیکرٹری ہے۔اس سے قبل بوریوالا میں ایک جمود کی کیفیت تھی ۔نئے لکھاریوں کی تربیت کے لئے نظمینہ کی بنیاد رکھی گئی تو عقیل عباس کی بوریوالا آمد سے اس تنظیم میں نئی روح آ گئی۔ میری اس سے تقریباً ہر روز کی ملاقات ہے۔ہم گھنٹوں ادب پر بات کرتے ہیں ۔ایک ایک تخلیق پر تنقیدی گفتگو۔۔۔۔ ابھی چند دن قبل ہی اس نے اپنا لکھا ہوا مائیکروفکشن مجھے سنایا تو میں نے اسے مبارک باد دی۔ پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ ہر روز ایک دو مائیکروفکشن تخلیق پانے لگے جلد ہی یہ سلسلہ کتاب تک پہنچ گیا۔عقیل عباس ادبی چاشنی کو قائم رکھتے ہوئے مختصر جملوں کی مدد سے قاری کے ذہن میں ایسی تصویر بناتا ہے کہ اس کا مطمع نظر واضح ہو جاتا ہے۔اسی خوبی نے اسے بے پناہ قارئین سے نوازا ہے۔

عقیل عباس !ربِ اظہار نے تمہیں لفظ کی حرمت عطا کی ہے۔اپنی صلاحیتیں تخلیق پہ صرف کرو۔ یہ پہلا پڑاؤ ضرور ہے لیکن ابھی تمہیں بہت اونچی اڑان بھرنا ہے، بس محنت اور لگن سے ادبی کام جاری رکھو۔تم جانتے ہو جب میں نے ترویٔنی کے نئے اسلوب کی تائید کی تو کھو کھلے ذہنوں نے اس پر ٹوٹ کر تنقید کی ۔تم پر بھی بہت انگلیاں اٹھیں گی۔کبھی ہمت نہ ہارنا۔خون جگر صرف

کرو خدائے سخن مہربان ہو گا۔تم تخلیق کار ہو، کچھ نیا کرنا جرم نہیں ہے،تم کٹہرے میں کھڑے ہو کر جواب دہ نہیں ہو۔نہ بہتوں سے دوستی اچھی۔۔۔نہ بہتوں کا ویر۔علمی وادبی دنیا میں یہ کتاب مستقل حوالہ بنے گی، میں تمہارے لئے دعا گو ہوں!

وسعت فکر کا تو یہی تقاضا ہے سو مجھے یہ کہنا پڑے گا!

خوش آمدید اردو ادب میں مائیکروفکشن کی پہلی کتاب میرے سامنے ہے جس نے طرفۃ العین میں میری توجہ اپنی جانب جذب کر لی، چند لائنوں میں جوالامکھی قید کرنا کوئی آسان کام تو ہے نہیں لیکن یہ کام عقیل عباس نے کر دکھایا۔مائیکروفکشن لکھاری سے پوری سنجیدگی اور ریاضت کا تقاضا کرتا ہے۔عقیل عباس ایک نومشق فکشن نگار ضرور ہے لیکن جس سلیقے سے اس نے مائیکروفکشن لکھے ہیں وہ اس کے فن کی پختگی کی دلیل ہے۔قدرت نے اسے یہ وصف عطا کیا ہے کہ وہ اپنے قلم سے چھوٹے چھوٹے لفظ لکھتا جاتا ہے اور کاغذ پر اس منظر کی پوری تصویر بن جاتی ہے پھر وہ منظر قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے اور قاری حیرت کے ایک جہان میں چلا جاتا ہے وہ لطف کی ایک ایسی کیفیت ہے جہاں سے وہ خود بھی واپس نہیں آنا چاہتا

زعیم رشید
صدر ادبی تنظیم نطمینہ
www.zaeemrasheed.com

تہنیت نامہ

جہانِ ممنوع جہاں قدغنیں شعار زیست ہیں وہاں عقل عباس متنوع اسالیب لیے تحیر خیز فضا قائم کرنے میں مگن ہے اس کی تحریر جو ادب کی نئی صنف مائیکرو فکشن کے اصول وضوابط کو مدنظر رکھ لکھی گئی ہوتی ہے تاثر، کیفیت اور جہت سے گندھی ہوتی ہے۔

مطالعے کے دوران آپ محسوس کریں گے کہ اُسے رنگین بیانی میں خاصی دلچسپی ہے لیکن وہ بیانیے کو سطحی کے بجائے آفاقی لبادے اُوڑھنے کی بھی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔جس میں میری دانست میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتا ہے ۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا تھا کہ ہر نسل کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تنقید خود پیدا کرے اور اپنی فکرو پیمانوں اور معیاروں کا از سرِ نو جائزہ لے، مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ عقیل عباس معاصر فضا کو نظر میں رکھے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے اس فیصلے پر عمل کرتا نظر آ رہا ہے۔ مجھے یہ بھی فخر ہے کہ مائیکرو فکشن کی پہلی کتاب کا سہرا میرے شہر منڈی بہاؤالدین کے حصے میں آیا۔عقیل عباس رب اظہار سے تمہاری استقامت کے لیے ملتمس ہوں۔

نعیم رضا بھٹی

عقیل عباس ۔۔ایک مائیکروفکشن نگار

تمام تر اصناف نثر کی ماں داستان گوئی ہے۔ ہر نثر پارہ داستان گوئی کی اولاد ہے۔کوئی ڈائرکٹ اولاد ہےاور کوئی اولاد در اولاد ہے۔بھلے اس کے نقوش ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر اس کی ہیئت کی کنذائی ایک ہی ہے۔ داستان سے ناول، ناول سے افسانہ، افسانہ سے افسانچہ اور اب مائیکروفکشن ہے۔

بہت سارے لوگ مائیکروفکشن کو افسانچے کا بدل قرار دے رہے ہیں۔ مگر افسانچہ اور مائیکروفکشن میں بہرحال بہت سے اختلافات کے باوجود اتفاقات بھی ہیں۔ چھوٹا نثر پارہ بہرحال دونوں کی تفریقات میں اشتراک رکھتا ہے۔یہی ان دونوں کا حُسن ہے۔

مائیکروفکشن ایک اعتبار سے بہت مختلف ہے کہ یہ اس دور میں پیدا ہوا جس میں الیکٹرانک میڈیا اپنے زوروں پر ہے۔ مائیکروفکشن کے بارے میں اگر کہا جائے کہ یہ فیس بک کی پیداوار ہے تو قطعاً بے جا نہ ہوگا۔اس کی طوالت جتنی بھی ہو مگر ایک بات طے ہے کہ مائیکروفکشن کا معیار ایک فیس بک پیج پر نظر آنا ہی قرار پائے گا۔ایک خوبصورت تخلیقی سکیچ جو مائیکروفکشن کے تخلیقی مظہر کا اظہار قرار پائے اس کی تشریح و وضاحت اس کے نقشِ مخصوص سے ابلاغ کی مسند پر متمکن ہو جائے، ہی کامیاب مائیکروفکشن ہوگا۔

اب آتے ہیں عقیل عباس کے مائیکروفکشن کی طرف۔ عقیل عباس بہت شارپ اسٹیج مائیکروف نگار ہے۔اس کا مائیکروفکشن "دلھن" اور "سفر الخیر" کی

طرف ٹریولز کرنے والا مائیکروفکشن ہے۔ "ایفروڈائٹ"، "سیفو کے نام "،"Longing" اور "لزباس کی ملکہ" ایسے مائیکروفکشن ہیں جن میں اساطیری مزاج کی جھلک کے ساتھ حیران کن مواد موجود ہے۔

عقیل عباس میں مائکروفکشن لکھنے کی اہلیت خداداد ہے۔ وہ لفظوں کی ایسی گل کاری کرتا ہے کہ لفظ اپنے مفہوم کو اندازِ ہمدم دیرینہ کا مزاج اوڑھتے ہوئے آپ کی روح کو لطف کے جزیرے میں منتقل کر دیتا ہے۔ "فیشن " "بھوک" "زمین" ایسے موضوعات ہیں جنہوں نے "پیر صاحب" کو "نرگس" کی "بقا" کا توارد قرار دے دیا ہے۔ "دنیا" میں شعوری سازشیں کرتا ہے مگر عقیل عباس "لاشعور" سے سازشیں کرنے کا عادی ہے۔ اس کی شرارتیں "سپارٹکس" اور "ادھیڑ پن" کو مائکروفکشن میں ڈھال کر اسے نظم، قوس اور "اے ٹی ایم مشین کو کمپیوٹر اور بالاخر فیس بک کا پرتو قرار دیتی ہیں۔ مائیکروفکشن ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے جس کا سہرہ عقیل عباس کے سر ہے۔

عہد جدید کے خوبصورت شاعر زعیم رشید نے لندن سے واپس آ کر ادبی تنظیم نظمینہ کی بنیاد رکھی تو اس کی بدولت کئی نوجوان شعراء سے تعارف ہوا عقیل عباس انہی نوجوانوں میں سے ایک ہے جو نظمینہ کا جنرل سیکرٹری ہے۔ نظمینہ مشاعرے کی روایات کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ بہت سا ادبی سرمایہ کتابی صورت میں بھی سامنے لا رہی ہے۔ گروہ بندیوں سے بالا تر ہو کر زعیم رشید ہر وقت نوجوانوں کو ادبی کام کرنے پر اکساتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس نے نظمینہ کے ہر ممبر

میں کچھ نیا کرنے کی جستجو بھر دی ہے۔ادبی تحریک میں ان کی مزید ترقی کے لیے دعا گو ہوں ۔رب ذوالجلال مزید برکتیں اور کامرانیاں عطا فرمائے! آمین

اے غفار پاشا ایڈووکیٹ ہائیکورٹ

صدر غالب اکیڈمی بوریوالا

پیش لفظ

مائیکروفکشن ایک ایسی صنف ہے جو اردو ادب میں اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی ہے۔ غیر ملکی ادب میں مائیکروفکشن پر بہت کام ہو رہا ہے لیکن مائیکروفکشن کو اردو ادب میں متعارف کروانے کا سہرا سید تحسین گیلانی کے سر ہی جاتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے اقدامات لائقِ تحسین ہیں۔

مائیکروفکشن اور سید تحسین گیلانی سے میرا تعارف بیک وقت ہوا تھا۔ ایک دن سید تحسین گیلانی، زعیم رشید اور ہمارے ایک مشترکہ دوست کے ساتھ بوریوالا میں ہماری رہائش گاہ پر تشریف لائے جہاں ان سے مائیکروفکشن پر تفصیلی بات ہوئی۔ بعدازاں انہماک فورم پر میرے دو مائیکروفکشن پیش ہوئے۔ جس سے میری کافی ہمت بندھی اور میں لکھتا رہا۔

پھر ماہنامہ ندائے گل کا مائیکروفکشن نمبر آ گیا جو اردو اب میں کسی مجلّہ کا پہلا مائیکروفکشن نمبر تھا۔ اسی طرح بوریوالا میں پہلی مائکروفکشن کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ جس کے بعد اب ضروری ہو گیا تھا کہ اردو اب کی پہلی مائیکروفکشن کی کتاب منظرِ عام پر لائی جائے۔

"دلہن اور دوسرے مائیکروفکشن" میری پہلی ادبی کاوش ہے۔ امید کرتا ہوں ناقدینِ ادب کو یہ صنف اور اس کے ساتھ میرا برتاؤ اچھا لگے گا۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ہمیشہ بہترین دوست میسر آئے، خاص کر بوریوالا کی سرزمین پر، جہاں میں روزگار کے سلسلہ میں پچھلے تین سال سے مقیم

ہوں۔ زعیم رشید ایک انتہائی مخلص دوست اور ایک مہربان بھائی کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ مجھے یاد ہے جب میں شروع شروع میں بوریوالا آیا تھا تو مجھے کسی نے بتایا تھا زعیم رشید بہت کم لوگوں سے ملتا ہے اور میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان بہت کم لوگوں میں سے ایک ہوں زعیم رشید جن سے بہت زیادہ ملتا ہے۔

بوریوالا اور زعیم رشید میرے بہت اچھے دوست ثابت ہوئے۔ زعیم رشید کی بدولت ہی میرا تعارف اے غفار پاشا جیسی قدآور ادبی شخصیت سے ہوا جو بعد میں بہت خوبصورت تعلق میں بدل گیا۔

زعیم رشید نے اس کتاب کے پہلے مائیکروفکشن سے لے کر آخری مائیکروفکشن تک نہ صرف ہر ایک کو پوری توجہ سے سنا اور سراہا ہے بلکہ اپنے پرمغز علمی تبصروں سے بھی میری رہنمائی کی ہے۔ جس کے لیے میں ان کا بہت شکرگزار ہوں۔

ڈیزائن ہاؤس۔۔۔ محسن رضا اور شہباز اسلم بہت پیارے دوستوں کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ انہی دوستوں کی محبت، توجہ اور خوبصورت مشوروں کے باعث یہ کتاب طباعت کے مراحل تک پہنچی۔ اس قدر خوبصورت ٹائٹل بنانے پر میں شہباز اسلم کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ کچھ ایسے دوست ہیں جن کا میں فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو نہ ہوتے تو شاید میں زندگی کے اس شعبہ میں اتنی رفتار سے آگے نہ بڑھ رہا ہوتا۔ جن میں جناب نعیم رضا بھٹی

صاحب سرِ فہرست ہیں۔

منڈی بہاؤالدین میں حلقہ اربابِ ذوق کے بانی، خوبصورت شاعر اور میرے محسن میرے استاد نعیم رضا بھٹی صاحب سے میرا تعلق بہت پرانا ہے۔اب تو صحیح سے یاد بھی نہیں کیونکہ اس کی جڑیں وقت کی جڑوں میں کہیں مدغم ہو رہی ہیں۔۔

نعیم رضا بھٹی وہ پہلا شخص ہے جو ادب کے حوالے سے مجھے ملا تھا۔ آپ سے میں نے شاعری کے علاوہ بھی بہت کچھ سیکھا ہے جو رہ گزارِ زیست میں میرے لیے زادِ سفر سے کم نہیں۔ جہاں مجھے ضرورت محسوس ہوئی نعیم رضا بھٹی ایک مشفق دوست اور ہمدرد خیر خواہ کی طرح ہمیشہ مجھے میسر رہے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میرا استاد میرا بہت اچھا دوست ہے۔ان کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔

جناب عامر حیات صاحب

غالباً میں چھٹی یا ساتویں جماعت کا طالبعلم تھا جب میرا ادبی رجحان دیکھ کر میری پیٹھ تھپتھپانے والے پہلے شخص میرے اسکول کے استادِ محترم عامر حیات صاحب تھے۔انہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔اسی خود اعتمادی کے باعث آج میں یہاں کھڑا ہوں۔اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔

اس کے علاوہ حلقہ اربابِ ذوق منڈی بہاؤالدین کے دوستوں کا

ساتھ مجھے ہمیشہ حاصل رہا جن میں سید حسین احسن، حکیم محبوب زاہد، عدنان دانش، زاہد مرزا، ادریس قریشی صاحب، زمان نیاز گورسی اور دیگر احباب شامل ہیں۔

ادبی تنظیم نظمینہ بوریوالا، بطور جنرل سیکریٹری نظمینہ یہ میرا فرض بھی بنتا ہے ان دوستوں کا شکریہ ادا کرتا چلوں جن کی رفاقت ہمہ وقت مجھے حاصل رہی جن میں آصف شہزاد آصف، عامر زمان عامر، ابرار پارس جیسے پیارے دوست شامل ہیں۔

اپنے دوستوں میں مجھے محمد مجتبیٰ سپرا کا شکریہ ادا کرنا ہے۔جس کے ساتھ میں نے کالج کے دنوں سے اب تک اپنی زندگی کے اچھے دن گزارے ہیں۔ وہ ہمیشہ مجھے ایک خوبصورت دوست اور بھائی کی طرح میسر رہا ہے۔

مجھے یاد ہے کالج کے دنوں میں اکثر میں ہاسٹل سے اس کے گھر شفٹ ہوجایا کرتا تھا - جہاں میں نے کبھی اجنبیت محسوس نہیں کی-آنٹی اور انکل نے ہمیشہ اپنے بیٹے کی طرح مجھے بھی اپنی محبتوں میں شامل رکھا جس کا قرض میں کبھی نہیں چکا سکتا۔ دعا ہے اللہ پاک اس خاندان کو ہمیشہ خوش رکھے۔

ظہیر عباس بہت پیارے دوستوں کی طرح میرے ساتھ رہا۔اس کا اپنا ادبی ذوق بہت اچھا ہے۔اور ایک بہترین کولیگ کی طرح اس نے میرے پروفیشن کو کبھی میرے شوق کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ ہمیشہ میری مدد کرنے کو تیار۔۔

اپنے قریبی دوستوں میں انعام الحق، ارمغان تارڑ، اعتزاز احسن، سمیع اللہ، شناور

حسین، بھائی گلفراز احمد، عدیل عباس، محسن علی، محمد امین، ضمیرالحسن اور فیضان احمد کا مجھے شکریہ ادا کرنا ہے جن کا ساتھ اور محبتیں مجھے حاصل رہیں۔

نشان انجینئرز کے دوست جن میں انجینئر عبدالاسلام صاحب، چوہدری اصغر سلیم، شاہد محمود، رضوان سندھو، جاوید احمد، مبشر چوہدری اور ایک لمبی لسٹ ہے جو میں انگلیوں پر گنوا سکتا ہوں جن کا تعاون مجھے حاصل رہا۔ اور ان تمام لوگوں کا جن کے میں نام بھول رہا ہوں جو میری زندگی میں ایک خوبصورت باب رہے ہیں، میں شکرگزار ہوں۔

اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ کوئی بھی شخص اپنے گھر والوں کی توجہ اور محبت کے بغیر ادھورا ہوتا ہے۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں یہ سب میرے والدین کی دعا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر انہیں ہمیشہ سلامت رکھے اور میرے بہن بھائیوں اور اس کو بھی جس کے دم سے میری زندگی رنگین ہے۔ ہمیشہ میرا خیال رکھنے اور میری بکھری ہوئی زندگی کو سمیٹنے والی میری خوبصورت شریکِ حیات۔۔

تمہارے بغیر شاید یہ سب ممکن نہ ہوتا۔ ہر بات کے لیے شکریہ۔ پھر چاہے وہ ایک خوبصورت بیٹی کا تحفہ ہو یا عمر بھر کا خوبصورت ساتھ، تم ہمیشہ سلامت رہو۔ اور آخر میں، میں شکرگزار ہوں اپنے اللہ کا جس نے ہمیشہ مجھے میری اوقات سے زیادہ نوازا ہے۔

عقیل عباس

جنرل سیکرٹری ادبی تنظیم نظمینہ

استدعا

"میرے مالک۔۔۔

ہزاروں سالوں تک اسی طرح سر جھکائے میں تیری تعظیم و کبریائی بیان کرتا رہوں تب بھی میرا کوئی حق نہیں بنتا کہ میں تجھ سے کچھ مطالبہ کروں۔لیکن تجھ سے کچھ نہ مانگنا بھی تیری شان اور میری ذات کی اصل کے خلاف ہے۔میں ترا اِک ادنیٰ غلام ہوں۔مجھے بس اتنا حق ودیعت کردے کہ میں تجھ سے تجھی میں فنا ہونے کی استدعا کرسکوں۔میرے مالک مجھے آغوشِ رحمت میں جگہ دے کر میری آتشِ نہانی کو ختم کردے۔

میرے مالک۔۔۔

میرے مالک۔۔۔"

ایک صدا تھی لیکن صداکار کہیں نہیں تھا، تمام حقیقتیں دم بخود کھڑی ایک نئی حقیقت کی منتظر تھیں

<><><><>

عطا

مقربین۔۔۔ایک فریادی زمین کی کوکھ میں بیٹھا کچھ کہہ رہا ہے۔تم نے سنا کیا کہتا ہے؟

نہیں مالک۔۔۔

تو جاؤ اسے لے آؤ۔۔۔

آج اس کی رونمائی کا دن ہے اور ہاں اسے کہنا تیری سنی جا چکی ہے۔

اب اٹھ اور ہمارے ساتھ چل۔

<><><><>

سفر الی الخیر

تو تم سب سے پہلے کہاں جانا چاہو گے؟

میں۔۔۔میں تو مدینہ جاؤں گا، سنہ دو ہجری میں۔

اور تم؟

جانا تو میں نے بھی وہیں ہے لیکن میں ذرا گھوم پھر کر جانا چاہتا ہوں۔

اچھا۔۔۔تو کہاں کہاں جانا چاہتے ہیں جناب۔

بھئی سب سے پہلے تو میں ہابیل کے پاس جاؤں گا اس کے قتل سے ایک دن پہلے۔ کشتی نوح میں سفر کروں گا۔طور پر موسٰی کے ساتھ رہوں گا۔

لیکن مشین تو صرف معلوم زمانوں تک ہی رسائی دیتی ہے۔

اچھا۔۔۔ تو پھر میں ارسطو اور استاد فیثا غورث سے ملنے جاؤں گا۔لزباس کے جزیرے پر کچھ دن ٹھہروں گا۔سائرس اعظم کو مٹی کے برتن پر انسانی مساوات کا پہلا حکم نامہ لکھواتا دیکھوں گا۔جولیئس سیزر کو سینیٹ میں قتل ہوتا ہوا دیکھنا چاہوں

گا، قلو پطرہ کو مرتا دیکھوں گا

اور۔۔۔اور

روم میں گلیڈی ایٹر بغاوت کو دم توڑتا دیکھ کر Spartacus پر دیر تک ہنسوں گا اور پھر رو دوں گا۔ روم کو جاتی کسی سڑک پر بیٹھ کر غریب الدیار غلاموں کی سسکیاں سنوں گا اور جب تھک جاؤں گا تو میرے دوست میں بھی گوشہِ رحمت میں پناہ لینے تمہارے پیچھے مدینہ چلا آؤں گا۔ جہاں دوامی عظمتوں کا آفتاب پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہوگا۔

<><><><>

The Machines

ایک قبر پر ایک روبوٹ ہاتھ میں پھول لیے چپ چاپ کھڑا ہے۔کیا سوچ رہا ہے کسے خبر۔۔۔ اور فکر بھی کسے ہے۔

یہ جو ہم نے مشینوں کو انسان کے ذہن سے جوڑ دیا ہے۔انٹرنیٹ سے کشید ہوتی ہوئی سوچوں کے بدن تشکیل پانے سے تحلیل ہونے تک۔۔

ان مشینوں پر کیا گزرتی ہے۔

کسے معلوم کہ سوشل میڈیا پر مجموعی تاثر سے نتائج اخذ کرتی یہ مشینیں کس وقت کس فکر کی ذد میں ہوں۔ہم آپ تو اپنی دانش کا غبار ہندسوں میں رکھ کر سو جاتے ہیں۔

شب بھر انہیں کون دیکھتا رہتا ہے۔

شب بھر مشینیں جاگتی ہیں۔

<><><><>

مائیکروفکشن

وقت نے خود۔۔۔

یعنی عصر نے

تیرے ہونٹوں کی شفق پر ایک نظم لکھنا چاہی تھی۔

لیکن سرخ لبوں سے سرخ لہو تک کا فاصلہ بہت کم تھا۔ وقت ایک انجان لکھاری کی طرح تیرے ہونٹوں کے کناروں سے پھسل کر خون آلود نتھنوں سے گریز پا ہواؤں کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔۔۔

کائنات کے حدی خوانوں کا نغمہ تو سن۔۔۔

دیکھ۔۔۔ ملال کا رنگ کس قدر گہرا ہے۔۔۔

اپنے دل کی گرہ کھول اور وقت کو جگہ دے ۔۔۔

تا کہ اک نظم تو مکمل ہو۔

<><><><>

زمین

"ہائے میرے بچو!

مجھے بتاؤ میں کیوں اپنی چھاتی کے بال نہ نوچ لوں جبکہ زمین تباہ ہو چکی اور اس کا پانی پھٹ کر خراب ہو چکا ہے۔ایک ایک انچ دلدل میں تبدیل ہوتی زمین کا نوحہ کیوں نہ پڑھوں!

کیونکر میں بڑھے ہوئے ناخنوں کو اپنے گنجے سر پر زخم لگانے سے روک رکھوں۔

کیوں۔۔۔۔۔۔

کیسی شاداب زمین تج کے ہم لوگ خلاؤں میں بھٹکنے چلے آئے ہیں۔

میرے بچو۔۔۔میں یہاں مرتا ہوں تو جنت ملتی ہے زمین پھر بھی نہیں ملتی۔

ہائے۔۔۔۔میرے کرب کو سمجھو میرے بچو

ہائے۔۔۔۔"

وہ چپ چاپ اس کے پاس سے اٹھ کر باہر آ گئے۔ اندر کیبن میں زمین کی تباہی کی ضامن جنریشن کا ایک فرد اس بات سے بے خبر اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ اس کے پشت پیچھے اس کے یہی بچے جو اس کی بات سن لیتے تھے، اس پر ہنستے رہتے ہیں۔

<><><><>

پیر صاحب

اوئے تاج دِینا تیرا دماغ تو خراب نئیں ہوگیا جو تو پیر صاحب کو مار رہا ہے؟

چاچا شرفو مجھے چھوڑ دے میں اس کم بخت کو نہیں چھوڑوں گا

او ہوا کیا ہے کچھ بتا بھی تو۔۔۔

او چاچا میں کہتا ہوں مجھے اس ذلیل کو مارنے دے۔۔

اور اگر کسی کی عقیدت زیادہ جوش کھا رہی ہے تو وہ ایک "جھٹ" کے لیے اس پیر کو اپنے گھر بٹھا کر ذرا دوکان سے مشروب کی بوتل لینے تو جائے۔۔

اوئے تاج دِینے تو سچ کہہ رہا ہے؟

اور چاچا میرا دماغ چل گیا ہے کیا؟

اوئے لڑکو، پکڑلو اس پیر کو اور لے چلو ڈیرے پر۔۔۔ بڑا آیا پیر صاحب۔۔۔

چل اوئے آگے لگ

چل۔۔۔۔

<><><><>

بدھو دیو

تم نے بدھو دیو کی کہانی تو سنی ہوگی۔

وہ۔۔۔وہی جو شہزادے کو دوسرے بادشاہ کے پھلوں کے باغ سے ملا تھا۔

ذرا سوچو جب وہ پھلوں کا ٹوکرا اور شہزادے کو اٹھائے شہر میں داخل ہوا ہوگا تو کیسا منظر ہوگا۔

سازشی وزیر اور اس کا نائی کیسے جل بھن گئے ہوں گے۔

بلاشبہ بدھو ایک اچھا معاون تھا۔شہزادی کو بے رحم دیو کی قید سے چھڑانے میں اس نے قدم قدم پر شہزادے کی سہائتا کی تھی اور شہزادے کی زندگی کتنی آرام دہ تھی۔

حقائق کی فصیلوں سے ادھر میں بھی کوئی بدھو دیو ہوں۔۔۔

جو اپنی سوچی ہوئی کہانیوں کے ہر مرکزی کردار کی سہائتا کرتا ہے اور خوش ہو کر تالی بجاتا ہے۔

<><><><>

Traveller

اھلا بک

شکریہ! معاملات کیسے ہیں

پیچیدہ

تم ملکی وے گئے تھے اس دفعہ؟

ہاں۔

کیا خبر ہے۔ خدا کے نائب کی سناؤ۔۔۔ ارتقا مکمل ہوگیا؟

انسان ختم ہوگیا۔ زمین تباہ ہوگئی اور اس کا پانی پھٹ گیا۔

کتنا عرصہ ہوگیا؟

چھے دن اور ساتواں جاری ہے۔

وجہ کیا رہی؟

بگاڑ۔

خیر یہ تو ہونا ہی تھا عقل کا بارِ خطیر کس سے اٹھا ہے۔

انہیں ذہانت کے ساتھ جذبات کے تصادم نے تباہ کیا۔

تو اب اگلا نائب کون ہوگا؟

کوئی نہیں۔

انت؟

ہاں انت۔

کتنا وقت بچا ہے؟

ایک ساعت یا اس سے بھی کم۔

بڑائی بیان کرو۔۔۔۔۔۔

حق۔۔۔حق

<><><><>

فیصلہ

اور جب میرے چیتھڑے اڑ جائیں گے پھر تو یہ پاس بھی راکھ ہوکر ضائع ہوجائے گا۔تو پھر میں جنت کے دربان کو کیا چیز دکھاؤں گا؟

اور اگر وہ لوگ بھی۔۔۔جو اس دھماکے میں میرے ساتھ مرنے والے ہیں وہ بھی وہاں موجود ہوئے تو اور اگر انہوں نے میرا گریبان پکڑلیا تو میں کیا کر سکوں گا؟

ہر قدم وہ مقررہ مقام کے قریب ہوتا جارہا تھا۔اس کے پاؤں سے منوں بار بندھا ہوا تھا۔

ایک جھگڑا اس کے اندر جو شروع ہوا تھا ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

بالآخر زندہ رہنے کی خواہش فرضی جنت کی خواہش پر غالب آگئی اور اگلے ہی موڑ سے وہ اپنی سمت تبدیل کررہا تھا۔

<><><><>

ایکٹریس کا شوہر

کل رات بھی تمہارے سو جانے کے بعد دیوار پر لٹکتی پینٹنگ کے تینوں بونے چپکے سے میرے پاس اتر آئے تھے۔

کبھی وہ میری شرٹ کا کونہ پکڑ کر کھینچ لیتے تو کبھی میرے بال خراب کرنے لگتے۔ دیر تک وہ میرے ساتھ کھیلتے رہے اور پتا ہے کبھی کبھی تو وہ اپنے گال میرے گالوں سے رگڑنے لگتے اور پھر تمہاری طرف دیکھ کر منہ بسورتے رہتے۔ کل بھی تمہارے جاگنے سے پہلے وہ واپس اپنی پینٹنگ میں گھس گئے تھے۔

دیکھو ناں۔۔۔ میں کسی دن انہیں روک لینا چاہتا ہوں لیکن یہ تمہاری شوبز کی مصروفیات اور فگر کی فکر دونوں مل کر میری خواہش کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

<><><><>

بے بصر

اس کا جنم ایک تجربے کے مرہون ہوا تھا۔

سائنسدانوں نے انسانی ڈی-این-اے میں کچھ جانوروں کے ڈی این اے کو ملا کر تجربات کیے تھے جن کا مقصد انسان میں مخصوص خصوصیات کا پیدا کرنا تھا۔

وہ اس کڑی کی دوسری کھیپ میں پیدا کیا گیا تھا-

جس کا مقصد غیر مرئی مخلوق کی نشاندہی کرنا تھا-

یہ تجربہ کامیاب رہا اور وہ بھی کتے اور گھوڑے کی طرح اچانک چونکتے ہوئے مضطر ہو کر پہلو بدلنے لگتا تھا-

وہ خوش تھے کہ کائناتی رازوں سے پردہ ہٹنے والا ہے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ کائنات کی بے بصر حقیقتوں کا بارِ خطیر کم از کم ان کی یہ کھیپ تو نہیں اٹھا سکتی تھی۔

اس لیے جب اس کی زبان سلب ہو گئی تو انہوں نے ایک اور تجربہ کرنے کی متفقہ قرارداد منظور کر لی۔

<><><><>

بقا

تم اسے مار سکتے تھے پھر مارا کیوں نہیں؟۔

میری تلوار ایک شاعر کے خون سے آلودہ ہو، یہ میں نہیں چاہتا تھا۔

مگر وہ شاعر تمہارے دشمن قبیلے سے ہے۔

اس نے میرے حق میں بھی رجز پڑھے ہوئے ہیں۔

اس لیے تم نے اسے چھوڑ دیا۔

نہیں۔

تو پھر؟

میں نے مظاہرِ فطرت کے ایک گواہ کی جان بخشی ہے۔

تم نے اپنی بقا کا سودا کیا ہے۔

شاید

ہاں،تم اس کی جان کی قیمت پر امر ہونا چاہتے تھے۔

شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔

میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔

اچھا سنو،طبل بج رہا ہے میں چلتا ہوں۔

جاؤ اور ہاں،شان سے جیو

<><><><>

توارد

سب سے پہلے گروپ لیڈر جہاز سے اتری جو ایک پینتیس سالہ باوقار خاتون تھی
،اس کے پیچھے اس کی ساری ٹیم جو اس سمیت کل تین نفوس پر مشتمل تھی
ان کے پیروں تلے کچی دھات کی طرح سرخ ٹھیکرے جیسی بجتی ہوئی خشک سطح
تھی جس میں ان کے پاؤں کے تلوے ڈوب جاتے تھے۔
انہیں یوں لگا کہ جیسے یہ جگہ پہلے کسی کا مسکن رہ چکی ہے۔
مگر کسی قسم کی باقیات انہیں دستیاب نہ ہوسکیں۔
لیکن اچانک دور ایک پھڑ پھڑاتی ہوئی چیز نے ان کی توجہ کھینچ کر ان کے شک کو
مزید تقویت دی اور وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے جب وہاں پہنچے تو ان کے
اوسان خطا ہو گئے۔

وہ ایک اخبار کا ٹکڑا تھا جس پر ان تینوں کی تصویریں اور انٹرویو چھپے ہوئے تھے اور
وہ اخبار ان کی روانگی سے ایک ہفتہ پہلے کا تھا یعنی پانچ ماہ اور سات دن پہلے کا۔

<><><><>

سپارٹکس

دھوپ میں اس کے چمکتے بدن کی لچک اور اس کے وار کی گرمی دیکھ کر اکھاڑے کی سیڑھیوں پر بیٹھی خوش بدن لڑکیاں اپنی قبائیں پھاڑ لیتی تھیں۔

سینیٹ کے ممبران کی بیویاں اس سے ہم بستری کر کے اپنی سہیلیوں کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی پھرتی تھیں۔ دشمن اس کی ضرب کی شدت ناپتے تھے اور باتیاتس اس کے گن گاتا تھا۔

یہ سب اسی طرح چلتا رہتا مگر ایک دن ایک الوہی سوچ نے اس کے ذہن کے مقفل در پر دستک دی اور اس نے بغاوت کر دی۔ تھریشین غلاموں کے اس روحانی باپ نے کانوں سے لے کر اکھاڑے تک ہر میدان مارا تھا مگر وہ رومیوں سے ہار کر اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ مصلوب ہو گیا اور میرا ذہن ہے کہ آج بھی اس کی کہیں نہ بننے والی قبر کے سرہانے بیٹھا ایک عظیم ایمپائر کی تباہی کے تانے بانے بنتا رہتا ہے۔

دلہن

آج کی رات خدا کی روح مجھ میں حلول کرے گی

اور وہ چاہتا ہے کہ تم اپنا آپ میرے حوالے کر کے اس کی زوجیت میں آ جاؤ

اور یہ بتاؤ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں یا کہ یہ خواہش خدا کی نہیں؟

نہیں فادر!

تو پھر ٹھیک ہے آج رات تیار رہنا، کچھ داسیاں تمہیں تیار کر کے دلہن بنا دیں گی

اور پھر اس نے دیکھا-----

خدا کی روح ایک ایسے انسان میں حلول کر آئی تھی جو اس کے پاؤں کے بوسے لیتا تھا

تب اس نے جانا کہ وہ خدا سے عظیم تر ہے

حالانکہ وہ کہتے تھے کہ عورت ازلی گنہ گار ہے

اور اگر وہ ازلی گنہ گار ہوتی تو خدا اس شخص کے منہ سے، جو خود کو اس کا نائب کہتا ہے، اس کی جائے خفی کے بوسے لیتا!

ہرگز نہیں

پھر ہوا میں معلق اُس کے پاؤں کی طرح اس کی گردن بھی نخوت سے تن گئی

آج کی رات خدا اس کی دسترس میں تھا

ادھیڑ بن

اس نے ریڈیو پراس کی آواز سنی اوراس کے لہجے کی رسی سے لٹک کراس کے ذہن میں اتر گئی ۔وہ ایک شاعر تھا جواپنی نظم سناتے سناتے اچانک چپ ہوگیا تھا پھر اسے کھانسی کا دورا پڑااور ریڈیو سے اس کی لائن منقطع ہوگئی۔

اس کے ذہن میں گھستے ہی وہ گم ہوگئی

وہاں جو کچھ چل رہا تھا وہ اس جیسی ٹیلی پیتھی کی ماہر کی سمجھ سے بھی بالاتر تھا وہاں ایک کہکشاں آباد تھی، ہزاروں قیاس کی دنیائیں تھیں جوسینۂ شاعر میں سانس لیتی تھیں،کہیں بے انت خلا تھے،کہیں روشن اور مبارک صبحوں کی ضو سے منور شہر آباد تھے،کہیں تو ایسے صحرا جن کے سینوں میں آبِ حیات کے چشمے رواں تھے۔کسی رویے کولاشعور کی تھاپ پر نچایا جارہا تھا،کوئی خیال کسی لفظ کے آگے سرنگوں تھا تو کوئی لفظ کسی خیال کے پاؤں پر جھکا ہوا تھا

اور کچھ مصرِ ع جنہیں" مفعول فاعلاتُ مفاعیل فاعلن " کے وزن پر باندھا جارہا تھا۔ ذہن کے ایک کونے میں رات کو آنے والوں مہمانوں کی دعوت کا نقشہ تیار ہورہا تھا

ایک طرف بیوی کی فرمائشوں کی لمبی لسٹ ،جیب کی بساط اور مارکیٹ کے لیے وقت ترتیب پارہا تھا۔

اور اپنے ذہن سے باہر وہ آفس میں بیٹھا اپنا کام مکمل کرنے کی فکر میں تھا۔اس نے ایک لمبا سانس لیا اور اس کے ذہن سے باہر آ کر کافی دیر پرسکون لیٹی رہی۔ایک شاعر کے تخیل تک رسائی کا تجربہ ابھی پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا تھا۔

<><><><>

نظم

مجھ کو منظوم کرو

نہیں کر سکتا

وجہ؟

تمہیں مجھ کو اپنے جملہ حقوق دینا ہوں گے۔

دیئے۔

اچھا۔۔۔ تو پھر یہ ٹاپ اتار دو۔

کیوں؟

مجھے حقوق حاصل ہیں۔

لو۔

یہ بریزیئر بھی۔

یہ بھی لو۔

ہاں اب ٹھیک ہے!

تمہیں بتا دوں تمہاری پیشانی ہی سے نیکی اور بدی کی فکر جنم لیتی ہے اور تم جانتی ہو یہ ابھار عرشِ اول کے سینۂ خوش رنگ کے مخروط گنبد ہیں جن میں کائناتی تقدیس کے کبوتر بسیرا کرتے ہیں

اور نیچے کو لڑھکتی ہوئی یہ لائنیں وقت کی جڑوں سے مشتق ہیں جو انہیں فنا سے بری کرتی ہیں

اور تمہاری ناف۔۔۔۔

کاسۂ صنوبر ہے جس کے کنارے زیتون کا کام کیا گیا ہو اور جس میں خوش گمانی کی شرابِ خوش ذائقہ دعوتِ لطف دیتی ہے۔

تمہاری ڈھلوان چکنی مٹی سے پھسلتی پگڈنڈی کی مانند ہے جو دھوپ میں آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے

(توقف۔۔۔۔)

اور؟

زیر جامہ؟

میری آنکھیں ، میری زلفیں ، میری تھوڑی ، میرے کندھے،اور میری گردن تمہاری آنکھیں نورِازل کی عکاس ہیں،تمہاری زلفیں شبِ تار کے پھریرے، تمہاری تھوڑی عدن کی ناشپاتی اورتمہاری گردن جمالیات کےکوزہ گرکی صراحی ہے

اور؟

زیر جامہ؟

ہٹو!میں نہیں اتارتی۔

میں نے پہلے ہی کہا تھا۔

بھاڑ میں جاؤ۔

<><><><>

قوسین

اس نے چاک گھما کر چھوڑ دیا اور پھر بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگا
چاک سے لپٹی غلام گردشوں نے آنکھ کھولی اور سرپٹ دوڑنے لگیں
(یہ وہ غلام گردشیں تھیں جو ہر تحرک کا پیش خیمہ رہی ہیں)
یہاں تک کہ وہ آسمان کے بوڑھے باپ کی بارگاہ میں جا پہنچیں
آسمان نے اپنے کپڑے کو سات بار جھاڑا اور فضا میں تحلیل ہو گیا
سات تہیں اوپر تلے بچھ گئیں
اور پھر گردشوں نے اک حقیقت کے لباس کو جالیا
جس کی چادر کی دھجیوں سے کئی کہکشاؤں نے جنم لیا
انہی کہکشاؤں کی ایک ٹکڑی میں ایک سبز سیارہ پوری کائنات کی توجہ کا مرکز بن گیا کیونکہ اس کی گولائیاں اولیں چاک سے اترے بدن سے میل کھاتی تھیں۔
اب تمام تر غلام گردشیں اس کے تابع کر دی گئیں
اور کبھی کبھی یہ گردشیں ان گولائیوں کو بھی ان کی مادی حدود سے باہر دھکیل دیتی ہیں جیسا کہ ان کا کام ہے
لیکن اک استقامت سے یہ غلام گردشیں انہیں گولائیوں میں قید ہیں اور تا ابد، تا جسمِ ثانی یہیں قید رہیں گی۔ تاوقتیکہ صور پھونک دیا جائے۔

<><><><>

تیسری تصویر

یہ ایک پینٹنگ ہے۔دھیان کے رجحان ساز کی ایک پینٹنگ،فطرتِ انسانی کی کشتی کھیتے ذہنوں کی بیان کردہ ایک مدقوق صورت اور اس صورت کو پینٹ کرتا ہوا رجحان ساز طبقاتی تشخص۔ میں اسے غور سے دیکھتا ہوں۔ایک منظر ہے جس میں دو عورتیں ہیں۔ایک کے بال بھورے ہیں اور اس کی پشت میری طرف ہے۔ برہنہ پشت پر دوسری عورت کا ہاتھ جس نے سرخ دستانہ چڑھا رکھا ہے۔یہ دستانے والی عورت مکمل لباس میں ہے جبکہ دوسری عورت مکمل عریاں ہے۔عریاں عورت کا ایک ہاتھ سیاہ لباس والی کے کندھے پر ہے جبکہ دوسرا کہیں اور ہے۔اسی طرح دستانے والی کا بھی ایک ہاتھ ہی میں دیکھ سکتا ہوں۔دونوں بے حد حسین ہیں جس کا چہرہ میری طرف ہے وہ بھی اور جس کا نہیں وہ بھی۔میرا دماغ کہیں یونان کے ایک جزیرے کی ایک جھونپڑی میں پڑا کراہ رہا ہے۔میں سوچ رہا ہوں میری کمپیوٹر سکرین پر اس تصویر کا محرک کیا ہے،میری نئی کہانی کی کھوج یا میرے ذہن میں سیفو کی کسی بھرپور نظم کا بدن۔۔۔

یا پھر فطرت کے پات اچکنے والوں کی سازش؟

<><><><>

ڈر

رات اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے کمرے کے باہر کھڑی تھی اور کھڑکی مسلسل بج رہی تھی۔ میرا کمرہ ہاسٹل کی دوسری منزل کی آخری لین پر تھا اور کمرے میں، میں اکیلا تھا۔ دو ان دیکھی آنکھوں کی بصارت کا احساس میری گردن کی پشت پر تھا۔ میں نے ڈر دور کرنے کے لیے موبائل فون کے براؤزر میں فیس بک کھول لی توجہ بٹی تو ڈر کم ہوا لیکن کھڑکی اب بھی بج رہی تھی۔ سرپھری پاگل ہوا میرے رونگٹوں کے پیچھے پڑی تھی۔ ڈر جب کسی طرح کم نہ ہوا تو میں نے ایک بدنام ویب سائٹ کھول لی۔ رگوں میں منجمد لہو نے حرارت پکڑی اور دھیان نے ڈر کی فاختہ کو دبوچ لیا۔ تمام رات بھوت کھڑکی کے پٹ ہلاتا رہا، ہوا سرنگ سے گزرنے جیسی آواز پیدا کرتی رہی اور میں اپنے ڈر کو سہلاتا رہا۔ یہاں تک کہ دور کی مسجد سے اذان کی آواز فیڈ بیک کرنے لگی۔

<><><><>

NHE D-01

ہر پیدا ہونے والے بچے کو گروتھ بکس (Box Growth) میں رکھ دیا جاتا اور اس کے ذہن کو ایک مستقل روبوٹک جسم سے جوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ جسم ATM کارڈز کے ذریعے کسی بھی آئی ٹی بوتھ سے ڈاؤنلوڈ کیے جاسکتے تھے۔ کھیتوں میں کنکریٹ کے پلر کھڑے ہوئے تھے۔ درختوں کی جگہ شہروں میں کنکریٹ کے جنگل تھے۔ فطرت تصویروں میں قید ہو کے دیواروں پر ٹنگی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹ کھردرے ہوچکے تھے۔ وہ ہر ذہن کو ایک ڈائیورشن (Diversion) دے کر جملہ مقاصد حاصل کرتے تھے۔ کوئی ذہن ان کے تابع نہ ہوا ایسا کبھی ہوا نہ تھا۔ میرا جنم بھی اسی دور میں ہوا تھا۔ میری ماں ایک مشین تھی اور باپ اصلاً انسان تھا۔ وہ انسان بچاؤ تحریک کا بڑا رہنما تھا۔ قید کے دنوں میں فرار ہونے سے پیشتر مشینوں نے اس کے سپرم کا نمونہ محفوظ کرلیا تھا۔ انہیں توقع تھی کہ اس سے پیدا ہونے والا بچہ باغی انسانوں کے خلاف ان کا بڑا ہتھیار

ثابت ہوگا۔یوں میری پیدائش سے ایک بڑی امید وابستہ تھی۔ میں ان کے بڑے کام آتا اگر میں خود انسانوں سے متاثر نہ ہوگیا ہوتا۔اصل اور آزاد انسانوں سے جن پر پے در پے حملوں کے دوران میری ملاقات ایک مشین معاون مکمل انسان سے ہوگئی X2-GNT7 وہ ایک انسان تھی مکمل اور بھرپور انسان،اس کا ایک بھی انگ مشینی نہیں تھا۔ ہمارے ذہن آپس میں لنک ہوگئے تھے۔ایک فورس تھی جو ہمیں ساتھ رہنے پہ اکساتی تھی۔وہ اسے پیار کہتے تھے اور اس کا کوڈ NHE-D01 تھا۔ یہ جذبہ عمومی نہیں تھا،مگر یہی ایک جذبہ تھا جس کی روک تھام نہ ہوسکی تھی اور یہ کتنا مہلک تھا اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگاسکتے ہیں کہ انہوں نے سو برسوں کے انتظار سے ملنے والے انسانی تخم سے جنی سیمی ہیومین مشین کو بھی ضائع کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر این ایچ ای۔ڈی 01 کی تاثیر کا اندازہ انہیں اس وقت ہوا ہوگا جب وہ ہمیں لینے گئے ہوں گے اور انہیں ہمارے کیبن خالی ملے ہوں گے۔

<><><><>

انسان!

انسان۔۔۔ایک طرف سے کوئی پکارا تو سب چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔ دور دراز کے سیارے سے ایک عجیب الخلقت سیاح تو تقریباً دوڑ کر اس جگہ جا پہنچا جہاں کاؤنٹر پر ایک انسان اپنا کھاتہ کلیئر کرا رہا تھا۔ پھر کیا تھا عجیب عجیب شکلوں والے، سینگوں اور پروں والے، آگ میں جھلستے ہوئے ابدان اس طرف کو ہو لیے۔ میں بھی اپنی بے بدنی سمیٹتا سب کے جسموں سے راہ بناتا، سب سے آگے جا کھڑا ہوا۔

وہ دو تھے۔ ایک عورت اور دوسرا مرد۔ میں نے ساری زندگی کے سفر میں کسی آباد سیارے پر ایسی مخلوق نہیں دیکھی تھی۔ عزازیل کس بنا پر جھکنے سے رک گیا تھا۔ میں نہیں جانتا آج میں آدم وحوا کو دیکھ رہا تھا۔ ایک سجدہ تو بنتا تھا اور جب میں دو زانوں ہو کر جھکا تو میری دیکھا دیکھی سب مخلوقات نے سر جھکا دیے۔ وہ دونوں حیرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔ کائنات میں اتنی پیاری آنکھیں ماسوائے حوروں

کے اور کس کی تھیں؟ میرے خدا! یہ تو وہی ہیں جنہیں تو نے اپنے نمونے پر بنایا تھا۔ میں عقیدت سے لبریز ہو رہا تھا۔ اچانک کسی نے مجھے شانوں سے پکڑ کر اوپر اٹھالیا۔ آسمان کا بوڑھا باپ ۔۔۔۔ سب سہم گئے۔ اس نے سب کو ڈانٹ کر وہاں سے بھگا دیا اور مجھ سے کہنے لگا

انہیں سجدہ کر رہے ہو، جو اپنے منصب سے گر چکے ہیں اور جن کی حماقتوں نے زمین کو تباہ کر دیا ہے، ذرا دیکھو اس دلدلی مٹی اور پھٹے ہوئے پانی کو، اور پھر انہیں دیکھو جن سے عقل کا بارِ خطیر نہ سنبھالا جاسکا۔ میں نے باپ کی پوری بات سنی اور اپنی راہ چل دیا ان دونوں کے حال سے بے خبر۔ کہ وہ دیر تک وہاں کھڑے کفِ افسوس ملتے رہے۔

<><><><>

خلش

مجھے اجازت دے

کہ میں ترے بے داغ بدن پر اپنے بوسوں کی کشتِ سرسبز کاشت کرسکوں، ترے لمس کے مخملیں دھاگوں کی گتھیاں سلجھاؤں، اگر تو اجازت دے تو ۔۔۔۔۔

اور اگر تو مجھے اجازت دے تو میں ترے ریشمی گھاس ایسے بالوں کے نیم تاریک جنگل میں اپنی پوروں کے شہوار اتاروں اور پھر انہیں اس ترتیب سے حرکت دوں کہ تیری روح کے تار ہل جائیں۔

اور اے ٹھہرے ہوئے خاموش پانیوں کی ملکہ، بقا کی راہ میں میرے ہمراہی گھوڑے کو ندی کے گیلے لبوں پہ جھکی گھاس پہ منہ مارنے کی اجازت دے۔

اور پھر اس کو باڑھ آئی ندی میں اترنے پہ اکسا تا کہ وہ پانی میں ایک نئی زندگی کے جراثیم چھوڑ سکے۔

جیسا کہ تم جانتی ہو پانی ہی جیون کا پیش خیمہ ہے۔

لیکن میری ہم نفس ، یہ سب میری خواہش کے مختلف چہرے ہیں جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے تو مرے ہوئے بھی چھ سو برس بیت چکے ہیں اور مرا ذہن ایک کمپیوٹر چپ میں پڑا ہے۔
جس کو وہ پچانوے نوری سالوں کی دوری پہ ایک نئی دنیا سے رابطے کے لیے چھوڑ چکے ہیں اور تم میری چِپ میں پڑی ایک تصویر سے بڑھ کر کچھ نہیں ہو جبکہ میری ضرورت تو ایک بدن ہے، ایک مخملیں جسم۔

<><><><>

روبوٹ

پروفیسر۔۔۔ پروفیسر

کیا بات ہے؟ تم کچھ گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو۔

وہ پروفیسر صاحب ہمارے نئے روبوٹ نے بھی چھت سے کود کر اپنا ستیاناس کرلیا ہے۔

HM-00012 نے؟

جی ہاں

اچھا اس کا ملبہ اٹھالاؤ اور ہاں۔۔۔۔۔

اس مائیکروچپ کا دھیان کرنا جو اسے انٹرنیٹ پر بکھری معلومات تک رسائی دیتی تھی۔

اس کی مرمت کے بعد اس کی ضرورت پھر پیش آنے والی ہے۔

یعنی ایک اور تجربہ؟

ہاں ۔۔

یہ ساتویں بار تھا۔

میں سات سو بار کروں گا اور ایک نہ ایک دن ان مشینوں کو انسان بنا کے چھوڑوں گا۔

"پاگل بڈھا۔۔۔" وہ زیرلب بڑبڑاتے ہوئے لیب سے باہر نکل گیا۔

مضمحل

اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا پسینے کی ایک بونداس کی تھوڑی سے پھسلی اور گردن سے ہوتی ہوئی اس کی مخروط چھاتیوں میں دم توڑ گئی۔

پستول پر اس کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔ وہ پنجوں کے بل چلتی ہوئی دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی۔ حتی المقدور اس نے سانس کو روک رکھا تھا۔

کوئی آہٹ نہ پا کر اس نے دروازے کا ایک پٹ وا کیا۔

ذرا سا باہر جھانکا، برآمدے کے ستون کے پاس دھرے گلدان میں رات کی رانی ایک سانپ سے کھیل رہی تھی۔

اوران سے ذرا اُدھر اس کا سایہ غیر محسوس حرکت کر رہا تھا۔

اس نے اپنے سائے پر تین فائر کیے اور دروازے کو لاک کر کے بستر پہ ڈھے گئی۔

<><><><>

پاگل سائنسدان

میں ایک پیڑ کی گھنی شاخوں میں چھپا دوربین سے اپنی تدفین کا منظر دیکھ رہا تھا۔میری بیگم کا رورو کر برا حال تھا۔وہ قبرستان کے داخلی دروازے پر کھڑی تھی اور میری ماں نے اسے سہارا دے رکھا تھا جو خود بھی غم سے نڈھال تھی۔

بچے اپنی ماں کے رونے کی وجہ سے پریشان لگ رہے تھے۔

پھر آہستہ آہستہ سب لوگ جانے لگے۔وہ بھی ابو اور امی کے ساتھ چلی گئی۔

شام ہوئی تو قبرستان بالکل خالی ہوگیا۔میں درخت سے اترا اور اپنی قبر پر پہنچ گیا۔

آس پاس کسی کو نہ پا کر قبر کھودی اپنی لاش نکالی قبر درست کی اور اپنی لاش اٹھا کر لیب میں لے آیا۔

ایک نئی زندگی کی راہ میرے سامنے ہموار ہو چکی تھی۔اور پھر کچھ بے ترتیب لکیریں اور ایک مثلث کے اندر بنا ہوا نقشہ تھا۔

یہ اس ڈائری کا آخری ورق تھا۔ جو انہیں اس اپارٹمنٹ میں ملی تھی۔
ڈی ٹیکٹو اس ڈائری کا کیا کرنا ہے۔
اسسٹنٹ نے کمرے سے کام کی چیزیں اٹھاتے ہوئے کہا۔
مجھے دے دو
اور پھر اس کے اسسٹنٹ نے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے، وہ ڈائری اسے سڑک کے ایک طرف پڑے ڈسٹ بن میں پھینکتے دیکھا۔
وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ "پاگل سائنسدان "وہ بس اتنا ہی سن پایا تھا۔

<><><><>

مارس پر موت

تہہ خانے کی دیواروں سے آکسیجن پھوٹ رہی تھی۔ فضا میں نم کی ہلکی سی آمیزش تھی۔

زمین سے اس کا رابطہ منقطع ہوئے یہ تیسرا دن تھا اور وہ اس عالمگیر تنہائی کا متحمل نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی خوبرو خلاباز ساتھی ایک دن پہلے ماسک اتار کر اس عقوبت خانے سے نکل چکی تھی۔ جس کا مطلب خودکشی کے مترادف تھا۔

وہ بہت دیر سوچتا رہا بالآخر اس نے بھی ماسک اتارا اور تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔ ادھڑتی کھال کے ساتھ اس نے دروازے کے نزدیک ہی اپنی ساتھی کو دیکھ لیا جو اب ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ وہ بمشکل اس تک پہنچا اور اس سے لپٹ گیا۔ اندر تہہ خانے میں اچانک سکرین پر کچھ حرکت ہوئی اور ایک چہرہ خالی منظر کو تکنے لگا۔

<><><><>

ایجنٹ

"میں نے برف کے ایسے ٹکڑے دیکھے ہیں جن سے آگ کی لپٹیں اٹھتی ہیں۔
گھروں کے صحنوں میں گمان کی حد سے آگے تک کا سامان مہیار ہتا ہے۔ فاصلے سمٹ کر ایک وِش (Wish) تک آگئے ہیں۔
اس طرف ایک اور ہی دنیا ہے جو تم نے نہیں۔۔۔ میں نے دیکھی ہے۔
انسان کا مستقبل بہت زیادہ روشن ہے مشین اور انسان کے ملاپ سے ہم فنا پر قابو پاسکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اُدھر چلو۔۔ میرے ساتھ
میں تمہیں امر ہونے کا درس دینے آیا ہوں"
بہت خوب لیکن ذرا یہ تو بتاؤ تمہیں نیند آتی ہے۔؟
کسی انسان کے لمس کو محسوس کیے کتنا عرصہ ہو گیا؟

کھانے کا ذائقہ یاد ہے؟

مر جانے کو جی نہیں کرتا؟

مجمع میں سے ایک شخص آگے نکل کر اس سے پوچھنے لگا۔ وہ کچھ کھسیانا ہو کر تاویل پیش کرنے ہی کو تھا جب دیہی نظم و نسق کے ایک نمائندے نے اسے جا کر پکڑ لیا۔

اور اس کے ساتھ ہی مجمع چھٹ گیا۔

<><><><>

مکاشفت

لیکن زین پیر صاحب نے کہا ہے۔۔۔

یہ عجیب معاملہ ہے مار یہ۔۔پیر تو پیار کرنے والوں کی سہائتا کرتے ہیں۔

ادھر تو میرا گھر بننے سے پہلے ہی اجڑنے کی پیشین گوئیاں کی جا رہی ہیں۔

انہیں سب پتا ہے زین۔۔

انہیں کسی نے نہیں بتایا یہاں تک کہ کسی کو پتا بھی نہیں کہ ہم ملتے ہیں اور انہیں پتا ہے۔

وہ صاحبِ کشف و کرامات ہیں اگر انہوں نے منع کیا ہے تو ہماری بہتری کے لیے ہی کیا ہوگا ناں۔۔۔

اس سے بچھڑ کر اس کی کہی ہر بات میرے ذہن میں گونجتی رہتی تھی۔

تمہیں تو پتا ہے یار ظہیر۔۔

کتنا مشکل وقت کاٹا ہے میں نے۔۔۔

اور لوگ کہتے ہیں مرد متاثر نہیں ہوتا۔۔۔

اب جب دل کے ساتھ سمجھوتا کر کے اس کے بغیر رہنے ہی لگ گیا تھا۔

کل پھر اس کی کال آئی تھی تین سال بعد۔۔۔

کہہ رہی تھی امی ابو کو بھیجو ہمارے گھر۔۔۔

کیوں بھیجوں یار۔۔۔کل کلاں پھر کسی نجومی نے کچھ کہہ دیا تو۔۔۔

وہ کہہ رہا تھا اور ظہیر کے ذہن میں وہ تمام قصہ تازہ ہو رہا تھا جب اس کے قریبی دوست کی محبت ایک پیر کی پیشین گوئی کی نذر ہو گئی تھی۔

<><><><>

ڈرپوک

"باہر بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ بادل اپنے بھاری بھرکم رتھ کھینچ رہے تھے۔ بدشکل آدم خور۔ میرے لیپ ٹاپ کی سکرین پر گروپ میں نکلے دوستوں کے شکار کا مزا لے رہے تھے اور میں اپنے بستر میں گھسا ہینڈز فری لگائے Wrong Turn دیکھ رہا تھا۔ دو ایک بار بجلی کا بلب ٹمٹمایا لیکن میں نے دھیان نہ دیا۔ باہر ہوائیں کھڑکی کے شیشے پر ناک رگڑ رہی تھیں۔ میں پورے انہماک سے فلم دیکھ رہا تھا کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ اندھیرے نے فوراً پورے منظر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لیپ ٹاپ بند ہو گیا اور Wrong Turn کا آدم خور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے کمبل کھینچ کر اوپر لے لیا اور کچھ پڑھ کر اپنے اطراف پھونکنے لگا۔

تمام رات آدم خور میری پائنتی کھڑا دیکھتا رہا کہ کب میں کمبل ہٹا کر اسے دیکھوں اور وہ مجھے شکار کر لے۔ ایک دو دفعہ کسی نے کمبل کا کونہ کھینچا بھی لیکن میں نے

کمبل مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔نجانے کتنی دیر گزر گئی۔ ۔

یہاں تک کے نیند کے مہرباں ہاتھ نمودار ہوئے اور اس نے مجھے تھپک کر سلا دیا۔

12-14-14"

ڈرپوک۔۔۔

اس نے ڈائری کا ورق الٹتے ہوئے کہا اور پھر ڈائری اسی طرح رکھ کر اس کے کمرے سے باہر آ گئی۔

<><><><>

سزا

پیڑوں سے لٹکتی لالٹینیں ہوا کی حرکت کے ساتھ لرزاں تھیں۔

قلعے کی ٹوٹی دیوار کے ساتھ ساتھ خستہ حال پگڈنڈی پر ایک گاڑی بڑی سڑک کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اور کریم بخش پیڑ کے کھردرے تنے کے ساتھ بندھا سوچ رہا تھا۔

ایک وڈیرے کے خلاف جانے کی سزا کتنی بھیانک ہو سکتی ہے؟

<><><><>

ضرورت مند

رات اک چور میرے گھر میں گھس آیا تھا۔
میں نے اسے پکڑ کر گھر کی وحشت کے ڈر سے صبح تک کرسی سے باندھ کر برآمدے میں بٹھائے رکھا۔صبح ہونے کو تھی جب میں نے اس تمام سامان سمیت ،جو اس نے پکڑے جانے سے پہلے اپنے تھیلے میں ڈال لیا ہوا تھا،رخصت کر دیا۔
اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کے کام آ گئے۔
لیکن میں سوچتا ہوں ہم دونوں میں سے زیادہ ضرورت مند کون تھا؟
بلاشبہ تم۔۔۔
کیوں کہ تمہاری ضرورت اس کی ضرورت سے کہیں بڑی تھی۔
وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے پارکنگ تک آ گئے تھے جہاں وہ چور اس کی گاڑی کے پاس اس کا سارا سامان لیے کھڑا تھا۔

نرگس

ایک دن اس نے اپنے سارے کپڑے اتار کر خود سے ملاقات کی اور اپنے آپ پر فریفتہ ہوگئی۔ نرگس کی طرح جس نے ایک دن جھیل کے پانی میں اپنا عکس دیکھ لیا تھا اور خود پر عاشق ہو کر وہیں ۔۔۔ جھیل کنارے لیٹا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ دیوتاؤں نے اسے نرگس کے پھول میں تبدیل کر دیا۔ جیسا کہ یہ متھ ہے۔

لذت کا پہلا در اس پر اپنی دریافت سے کھلا تھا اور اب تو ہر روز وہ اپنی دریافت کی طلسمی چھڑی سے اپنے بدن کا ایک در کھولتی ہے اور اس شہر کی بھول بھلیوں میں کھو جاتی ہے۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی سہیلیاں اور ہم عمر لڑکے کیا کہتے ہیں۔

<><><><>

لاشعور کی سازش

وہ ایک مشہور ایکٹریس کی مخملیں بانہوں میں جھول رہا تھا۔
اس کی پور پور نشے میں ڈوبی ہوئی ہونے کے کارن اسے دھندلا دکھائی دے رہا تھا یہاں تک کے اس حسینہ کے خطوط بھی اس کی پکڑ میں کم ہی آرہے تھے۔
لیکن وہ جانتا تھا یہ وہی ہے۔ True Blood کی Sookie
اور پھر جب اس نے اس کے لمس کی مہک کو اپنے اندر اتارتے ہوئے اس کے بھر پور بدن کو بھینچا تو ایک لہر چھوٹ گئی اور وہ بیدار ہوگیا
ناگواری نے اس کے چہرے کی ہیئت کو پل بھر کے لیے تبدیل کردیا تھا۔
اس نے رانوں سے پھسلتی سیال گرمی کو محسوس کیا اور مسلی ہوئی چادر کو ہٹاتے ہوئے اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

<><><><>

ارتکاب

اس کے سامنے ہزاروں لوگوں کا مجمع تھا جن کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔

اس نے دیکھا۔۔۔۔وہ ایک میدان میں کھڑا ہے جہاں ڈھیر سارے بچے ہیں جن کی شلواریں اتری ہوئی اور گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔

اس نے پھر دیکھا۔۔۔

وہاں لوگ تھے جن کی گردنیں۔۔۔۔۔

اسے دنیا کے سب سے عمدہ کام اور اعلیٰ ترین منصب کے لیے چنا گیا تھا۔

ہزاروں لوگ اس کی تاجپوشی کی تقریب میں شرکت کر رہے تھے لاکھوں اسے ٹیلی وژن پر دیکھ رہے تھے

لاکھوں جن میں یقیناً

وہ بچے اور ان کے والدین بھی ہوں گے جن کی شلواریں۔۔۔

اسے لگا کہ ایک ایک ویڈیو ریکارڈ کرتے ہوئے وہ خود بھی ریکارڈ ہو گیا ہے
وہ بچے اس پر چلاّ رہے تھے " گھٹنوں کے بل، گھٹنوں کے بل"
اس کے اندر شور اٹھنے لگا اور وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور پھر مائیک پر آ کر اس نے جو کچھ کہا اور لوگوں نے جو سنا،
اس سے لاکھوں لوگوں کا مذہب پر سے ایمان اٹھ گیا۔

<><><><>

بھوک

کپڑے، جنہیں تم دھو کر سوکھنے کے لیے تار پہ لٹکا دیتی ہو۔ جب میں انہیں دیکھتا ہوں تو ان کا رنگ میری طلب کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ تیری پوشاک سے رستا ہوا پانی۔۔ جب میں اس کے نیچے کھڑا ہوتا ہوں میرے بالوں سے راستہ بناتا ہے تو یکایک مجھے پانی کا ذائقہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ لعاب میرے دہن کی دیواروں سے پھوٹنے لگتا ہے۔ یہ کتنا عجیب ہے اگر میں تمہیں بتاؤں ۔۔۔ تمہارے زیر جامہ کی باس تازہ کٹے سیب کی قاشوں پر نمک مَلنے سے اٹھنے والے احساس جیسی ہے۔ ان سب چیزوں سے جنہیں تم ہاتھ لگا کر رکھ دیتی ہو، میں تمہارے لمس کا خراج وصول کرتا ہوں اور جب تم میرے پہلو سے لگ کے سو جاتی ہو تو میں تمہارے بدن سے لپٹے بوسوں کی گرہیں اپنے مشتاق لبوں سے کھولتا ہوں۔

جہاں زاد بھوک کی کتنی اقسام ہیں کہ جن سے تم واقف ہو؟

اُس نے اچانک سے پوچھا تو وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

<><><><>

سیفو کے لیے

"میں سوچتا ہی رہتا ہوں اور ہوائیں تمہیں چھو کر بھی گزر جاتی ہیں۔

اور جب لیز بین Lesbian ہوائیں اپنے ہاتھوں سے تمہارے بالوں کو اڑاتی ہیں تو میں اپنے کمیاب تخیل کے سہارے کسی خواب کے کونے میں پڑا اونگھنے لگ جاتا ہوں۔

تا کہ ایک پل ہی سہی، کٹ جائے

تمہارے پاؤں سے لپٹتی ہوئی مٹی کی قسم۔۔۔۔

میں تو اِک دن بھی تمہیں موت سے پہلے نہ کہیں جانے دوں گا۔"

ہیکلِ زہرہ کے اُدھر ایک چرواہا اپنے ریوڑ کو ہانکتا جاتا اور یہ شعر دہراتا جا رہا تھا کہ جھیل کی طرف سے آتی ایک کسبی نے اسے دیکھ اور سن لیا تھا اور پھر۔۔۔اپنی

راہ سے ہٹ کراس کے پیچھے پیچھے چل دی تھی۔ یہاں تک کے وہ سیفو کی جگہ کے بالکل قریب سے گزر کر چرواہے کے گھر میں داخل ہو گئے۔ چرواہے نے اسے دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے پوچھا

تم میرے پیچھے یہاں تک آ گئی ہو۔۔۔کیوں؟

"سیفو کے لیے"

اس نے متانت سے جواب دیا۔

<><><><>

Aphrodite

آسمانوں سے اتر،
ایک دن تو بھی آسمانوں سے اتر
ریشمی پوشاک میں ملبوس کہ جس کے دھاگے میری سوچوں کے ابدان ادھڑ نے سے بنے ہیں۔میری خوش گفتار بیوی کی طرح میرے سینے پہ اترنے کے لیے آسمانوں سے اتر اور چھا جا میری سوچوں کے افق پر دیوی،
تا ابد اپنے غلاموں میں مجھے شامل کر کے مجھ سے بے وقعت و بے مایا کو جہاں بھر کے لیے معتبر کر دے، فلک کی بیٹی۔
"ایک انسان کے سوچے ہوئے بیدار بدن کی مالک۔" دھیمے لہجے میں اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کسی نے کہا

معبد کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا مسافر اس بات سے بے خبر تھا کہ بڑا پجاری اس پر ہنستا ہوا گزر رہا ہے۔ ہنستا ہوا پجاری ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے دیوی کا معبد بنانے کا حکم دیا تھا اور جسے دیوی پہاڑ کی چوٹی کے اُدھر روز ملنے آتی تھی۔ لوگوں کے چڑھاوے لینے اور پجاری کو ان کی دادرسی کا سامان کرنے کے طریقے بتانے۔۔۔

<><><><>

لزباس کی ملکہ

کاش ٹائم مشین میں ہم اپنے جسم کے علاوہ بھی کچھ لے جاسکتے۔کم ازکم Outre سے سلا ہوا میرا ہلکے آسمانی رنگ کا سوٹ،اس کے ایک فریگمنٹ کی طرح

Wrapped in a Blue Cloak

اور ایک بیاض۔۔۔۔۔ لوحِ ادراک پہ لکھے ہوئے شعروں کے علاوہ

بدن کی اولیں قدردان شاعرہ کے سامنے اپنے بدن کے عیب چھپانے کا ہنر

اور قرۃ العین طاہرہ کے دو شعر۔۔۔

لیکن اب۔۔۔ مجھے ڈر ہے کہ جب میں اس کے سامنے جاؤں گا تو اس حسین ساحرہ کے رعب سے میری زبان تو گنگ ہو جائے گی۔تھوک سوکھ جائے گا۔لفظ کسی سازش کے تحت فرار ہو جائیں گے تو میں ڈر رہا ہوں۔۔۔۔

کہیں وہ مجھے اپنا کوئی ہندوستانی غلام ہی نہ سمجھ بیٹھے۔

جب وہ اپنے تن پر سفید قبا لپیٹے ٹائم مشین کی طرف بڑھ رہا تھا،اس کی پریشانی دیدنی تھی۔

Longing

میں کس طرح بتاؤں یہ کیا ہے؟
کہ ہر دفعہ جب بھی میں تمہارے نزدیک آتا ہوں تو اک آگ میرے جسم کو ہلکی آنچ پر رکھ لیتی ہے۔لعابِ دہن سوکھنے لگتا ہے اور آواز سلب ہو جاتی ہے۔ زبان تالو سے چپکنے لگتی ہے۔ بدن ایک خستہ پُل کی طرح ، جسے بپھرے ہوئے وحشی سانڈ اپنے پاؤں سے پامال کر رہے ہوں، تھرتھرانے لگتا ہے اور پھر جب تم مجھ پر جھکتی ہو
تب مجھے علم ہوتا ہے تمہاری سانس بھی اسی بھٹی سے ہو کر آتی ہے جہاں میرا تنفس رہن رکھا ہوا ہے۔
تم شاعر پاگل ہوتے ہو۔۔۔بالکل پاگل ۔۔۔
اس نے ساری تمہید سن کر کہا
تم سے بہتر کون جانتا ہے۔
اس نے کہا اور دونوں ہنسنے لگے۔

چاک

اس بار میں نہیں بھاگا۔بس کھڑا رہا اور دیکھتا رہا۔

زیادہ سے زیادہ کیا ہو گیا؟

کچھ بھی نہیں۔۔۔

ایک کملایا ہوا لمس، ڈیڑھ بوند پانی اور ایک جلی ہوئی ناگوار بُو

صد شکر قبا چاک ہونے سے بچ گئی۔

<><><><>

Death of An Artist

تمہیں کچھ ملا ؟

نہیں اس نے خودکشی سے پہلے اپنا سارا کام نذرِ آتش کر دیا تھا۔ یہ ایک پینٹنگ ملی ہے جس پر اس کے دستخط کے ساتھ دس سال پرانی تاریخ ڈال رکھی ہے۔

"ایک آرٹسٹ کی موت" یہ اس کی شاہکار پینٹنگ ہے اس کے بعد اس کے کسی کام کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی جتنی شہرت اسے ملی تھی۔

اور اب وہ اس کے زیرِ سایہ سانس لینے لگا ہوگا۔ فن کی موت ہی فنکار کی موت ہوتی ہے۔

ایسا کرو اس کی موت کی خبر کے ساتھ اُس کی اس پینٹنگ کو بھی نشر کر دینا۔

بیچارہ آرٹسٹ

<><><><>

وما علینا

ہاں۔۔ہاں ماردو اسے بھی۔۔۔

تم کیا سوچ رہے ہو۔۔۔

تم اس کام میں جلدی کیوں نہیں کرتے ہواؤں کا ماتم سن رہے ہوناں۔

اپنی تلوار اٹھاؤ اگر تمہارے ہاتھ ٹوٹ نہیں جاتے تو اور جلدی کرو۔۔

خدارا جلدی کرلو۔۔۔

لیکن دیکھو۔۔ذرا اس کے شانت چہرے کو تو دیکھو۔۔۔

اور اپنے کسے ہوئے جبڑوں کا تناؤ بھی دیکھو۔۔۔

ایک مرد کے کیے کی سزا ایک عورت کو دیتے ہوئے۔۔۔

تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں گے۔۔

اگر نہیں ٹوٹتے تو پھر جلدی کرو۔

ہواؤں کا جگر پاش پاش ہے۔اس سے پہلے کہ کسی نادیدہ ہاتھ کی جنبش تمہارے
قلب کو پہلو سے کھینچ لائے جلدی کرو
اور آگے بڑھ کر اس کا سر تن سے جدا کر دو۔۔

<><><><>

ماں

"میں تھک گیا ہوں ماں۔
ماں میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں کہ تیری گودی کم پڑ جاتی ہے۔
ماں سب نے مل کر مجھے تھکا دیا ہے۔ میں ہار گیا ماں۔۔۔
میں ہار گیا۔۔۔
میں لوٹ رہا ہوں ماں۔
ممکن ہے انتظار کرتے کرتے میری آنکھ لگ جائے ماں۔۔
تو مرا سر اپنی گود میں رکھ لینا ماں۔۔۔
اور میرے بالوں کو سہلا کر وہ سکون دینا جو میری بیوی مجھے کبھی نہیں دے سکی ماں۔
ماں میرے بچے بھی تو تیرے بچے ہیں ان کا بھی میرے جیسا خیال رکھنا۔۔
اور ماں اس کا بھی۔۔۔
ممکن ہے لوٹتے ہوئے مجھے دیر ہو جائے پر تو فکر نہ کرنا

میں تجھے ضرور ملوں گا۔

میٹھے پانی کے حوض سے تو مجھے اپنے ہاتھوں سے پانی پلانا ماں ۔۔۔

میں آرہا ہوں ماں"

آج ہی اسے ماں نے کہا تھا" بیٹا تو چٹھی لکھ دیا کر فون پر اب تیری آواز سنائی نہیں دیتی ۔۔میرے کان بوڑھے ہوگئے ہیں"

چٹھی پر جو کچھ لکھا تھا اسے پڑھ کر ریسکیو اہلکار پتھر کا ہو گیا تھا۔

<><><><>

****

پارک میں ایک سل پر ایک فون پڑا تھا۔ میں نے جا کر دیکھا تو اس پر لکھا تھا" پک اپ"۔

میں نے فون اٹھالیا۔ ایک برقی رو میرے بازو سے ہوتی پورے بدن میں پھیل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں رنگوں میں نہا گیا اور میری ہیئت تبدیل ہوتے ہوتے میں ایک سمارٹ فون میں ڈھل گیا۔ تمام کائنات کا ڈیٹا میرے اندر ڈاؤن لوڈ ہو رہا تھا۔

ساری معلومات ترتیب سے رکھی جا رہی تھیں۔ ہر وہ چیز جو انٹرنیٹ سے جڑی تھی میری دسترس میں آ گئی۔

لیکن جب میں نے اسے استعمال کرنا چاہا تو مجھے پتا چلا میرا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

میں اب بھی اسی سِل پر پڑا منتظر ہوں۔۔۔کب کوئی مجھے اٹھالے۔۔

آپ کیوں نہیں اٹھالیتے۔۔۔

پتہ ہے۔۔ ٹیک پارک نیچر لنک روڈ ماڈرن اتیج"

" بکواس "اس نے ایک نظر دیکھا۔

اور ای میل ڈیلیٹ کردی۔

<><><><>

بندر

" کائنات کی تخلیق ایک لفظ سے ہوئی۔
اس لفظ کی گرہ کھلنے سے زمین آباد ہوئی اور زمین پر انسان کو اتارا گیا۔
اسے اعلی اور ارفع منصب پر فائز کیا گیا۔
دل اور دماغ ودیعت کیے گئے۔لیکن اب تم دیکھ رہے ہو
انسان نے حقائق کو مسخ کرنا سیکھ لیا ہے۔
وہ کہتا ہے پہلے بندر تھے جو ارتقائی مراحل سے گزر کر انسان بن گئے۔
میں کہتا ہوں پہلے انسان تھے جو عذابِ الٰہی سے بندر بن گئے۔
کوئی اعتراض "
ایک بندر کلاس روم میں لیکچر دے رہا تھا۔

ایک بندر نے ہاتھ کھڑا کیا۔

جی۔۔۔؟

یہ کیلے جو ٹیبل پر رکھے ہیں۔ کیا میں انہیں ہاتھ لگا سکتا ہوں۔

ضرور۔۔

میں بھی۔۔۔ میں بھی۔۔۔۔

سارے بندر شور کرنے لگے۔

<><><><>

بلاعنوان

انسانوں پر تمہاری ریسرچ کہاں تک پہنچی ہے۔
وہ ابھی خودشناسی کے مراحل میں ہیں۔
ان کی Myths کیسی ہیں۔
ان کی جو متھ ہے وہ ہماری اصل ہے۔
تو ہماری متھ ان کے لیے کیا ہوگی۔
لیکن ہماری تو کوئی متھ ہی نہیں۔
یہی ان کے لیے سب سے بڑی متھ ہوگی۔
تو ہمیں اور کتنا وقت لگے گا Superhuman دیکھنے میں۔۔
تین صدیاں اور۔۔۔اگر وہ بچے رہے۔
ہاں اگر وہ بچے رہے۔

<><><><>

پینسل اور چڑیا

وہ کچھ دیر اسے ہلاتی رہی۔

پھر اس پر چونچ مارنے لگی۔

خشک اور حیات کے رس سے بیزار لکڑی

اس نے سوچا۔۔

ایک دفعہ پھر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"فالتو"

اس نے کہا اور کھڑکی میں جا کر بیٹھ رہی۔

جہاں سے وہ ان پیڑوں کو دیکھ سکتی تھی جو ابھی زندہ تھے اور جن میں حیات کا رس موجود تھا۔

<><><><>

تہذیب کے قیدی

ایک بندر کو ٹائی کوٹ پہنا کر اس کی تصویر بنا کر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔

تمہارے اس فوٹو گراف کا کیا مقصد ہے اور یہ کیا ٹائٹل ہوا "تہذیب کے قیدی"

تہذیب کیا ہے؟ تم کیا سمجھتے ہو

تہذیب وہ معاشرتی ترتیب ہے جو ثقافتی تخلیق کو فروغ دیتی ہے۔

تمہارے خیال میں ایک وحشی مہذب نہیں ہوسکتا۔

وحشی اور مہذب۔۔۔کیا بات کرتی ہو

تہذیب کو کون کون سے عناصر متشکل کرتے ہیں؟

معاشی بہم رسانی، سیاسی تنظیم، اخلاقی روایات اور علم وفن کی جستجو۔۔۔

کیا ایک وحشی ان باتوں سے بہرہ ور نہیں۔ وہ اپنے قبیلے میں بڑی احتیاط سے ان چیزوں کا اپنے طریقے سے اطلاق کرتا ہے۔

لیکن بندر تو۔۔۔؟

بندر تمہارے اب وجد ہیں۔ انہیں تم غیر مہذب نہیں کہہ سکتے۔

طنز کیا جارہا ہے؟

میں سنجیدہ ہوں۔

اس نے کہا اور وہ اس کی شکل دیکھنے لگا۔

<><><><>

ہر کہیں ہے کوئی

گیان کیا ہے گرو جی؟

گیان وہ ہے جو تم نے جان لیا۔

اور جو نہیں جان سکے۔

اگر تم جانتے ہو تم کیا نہیں جان پائے تو وہ بھی گیان ہے۔

لاعلمی گیان نہیں ہے؟

اگر معلوم ہو کس چیز سے لاعلم ہو تو وہ بھی گیان ہے۔

گرو جی۔۔۔

چیلے۔۔

میں بھاگ جاؤں گا۔

لیکن تم کس سے بھاگنا چاہتے ہو۔

آپ سے گرو جی۔ ہر اس جگہ سے جہاں میں، میں ہوں اور کوئی اور کوئی اور ہے۔

لیکن بچہ جہاں بھی جاؤ کوئی نہ کوئی وہاں پہلے سے موجود ہوگا۔
خود میں ہی جھانک لو اندر کتنے "کوئی" موجود ہیں۔
کس کس سے بھاگو گے۔
کہاں جاؤ گے۔کہاں ہے ایسی جگہ جہاں کوئی نہ ہو اور یہ اب تم کہاں چل دیئے۔
کہاں جاسکتا ہوں گرو جی۔ میں یہیں ہوں ذرا بھوجن کا بندوبست کر کے آتا ہوں۔

<><><><>

وہ کون تھا؟

آہستہ سے دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔

دروازے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

ایک آدمی اندر آیا اور ملحقہ واش روم میں گھس گیا۔

کون ہو سکتا ہے وہ سوچنے لگا۔ پھر اسے یاد آیا اس ویرانے میں یہ اکلوتا ہوٹل تھا جس کا منیجر بھی اسے کمرہ دکھا کر سونے جا چکا تھا اور ملازم تو کوئی اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔

اور ہاں دروازہ تو اندر سے بند تھا۔

اسے یاد آیا۔

انہیں خنجراب پاس سے آتے ہوئے شام ہو گئی تھی۔ یہ الگ تھلگ ہوٹل ہی ملا تھا انہوں نے سوچا تھا رات ہی بسر کرنا ہے گزر جائے گی۔

اتنے وہ شخص واش روم سے نکلا اسی طرح دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔
وہ دروازہ بند کرنے کے لیے اٹھا تو اس کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔
دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھڑے کھڑے اس کا بدن بھیگ گیا۔
اس نے اپنے ساتھیوں کو اٹھایا تو وہ اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔
انہیں واپس آئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں لیکن یہ معمہ اب بھی وہیں ہے کہ وہ کون تھا۔

<><><><>

لبیک

لبیک اللھم لبیک
میرے مالک تمام تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں۔
جس نے مجھ ایسے بے مصرف قطرۂ نور کو آسمانوں سے زمین کی جانب روانہ کیا
تا کہ میں زمین پر تیرا اولیں گھر دیکھ سکوں۔
میرا اشرف اور میری وجۂ تخلیق کی معراج یہی ہے۔
اب میں اور کیا خواہش کرسکتا ہوں ماسوائے اس کے کہ میں تیری ذات میں سما جاؤں۔
لبیک اللھم لبیک۔۔۔۔۔
اہلِ زمیں کے ادراک سے پرے ایک اور بے بدن زمیں کا طواف کر کے لوٹ رہا تھا۔

<><><><>

سر اٹھاؤ

ہم تمہاری ریاضت کا پھل تمہیں دینا چاہتے ہیں۔

میرے مالک، میں بولنے سے قاصر ہوں۔ میرے پاس الفاظ ہیں نہ زبان۔

میں تیری عبادت کرتا ہوں یہی میرے ہونے کا حاصل ہے۔

اور یہ میرا شرف ہے کہ تو مجھ سے ہمکلام ہوا۔ اب اور کسی پھل کی تاب ہے نہ ضرورت۔

لیکن ہم چاہتے ہیں تم زمین پر جاؤ اور وہاں ہمارا گھر دیکھو۔

سبحانک اللھم!

اس سے بڑھ کر میں توقع بھی نہیں کر سکتا کہ اور نوازا جاؤں۔

اب جاؤ اور یاد رکھو زمین سے آنے کے بعد وہاں دوبارہ نہ جا سکو گے۔

سبحانک اللھم! یہ کیا کم خوش نصیبی ہے۔

سبحانک اللھم۔۔

<><><><>

افلاس

بھوک سے نڈھال بچے کہیں سے ایک مینڈک پکڑ لائے تھے۔

"اسے پکا دو ماں"

ماں نے دیکھا تو اس کا دل دہل گیا۔

وہ بچوں کو بٹھا کر نزدیکی نل سے پانی لینے چلی گئی۔

بچوں کو معلوم تھا ماں تب تک نہیں آئے گی جب تک وہ سو نہیں جائیں گے۔

اس لیے بڑے بچے نے جلدی جلدی مینڈک کو ایک ٹوکرے تلے قید کیا اور خود بان کی چارپائی پر اپنے سے چھوٹی بہن اور بھائی کے پاس آ کر لیٹ گیا۔

"آؤ ہم کچھ دیر سو جاتے ہیں تا کہ ماں جلدی آ سکے۔"

اس نے کہا اور وہ سو گئے۔

<><><><>



خوش آمدید! اردو ادب میں مائیکروفکشن کی پہلی کتاب میرے سامنے ہے جس نے طرفۃ العین میری کل توجہ جذب کر لی، چند لائنوں میں جو الا کھی قید کرنا کوئی آسان کام تو ہے نہیں لیکن یہ کام عقیل عباس نے کر دکھایا۔ مائیکروفکشن لکھاری سے پوری سنجیدگی اور ریاضت کا تقاضا کرتا ہے۔ عقیل عباس ایک نومشق فکشن نگار ضرور ہے لیکن جس سلیقے سے اس نے مائیکروفکشن لکھے ہیں وہ اس کے فن کی پختگی کی دلیل ہے۔ قدرت نے اسے یہ وصف عطا کیا ہے کہ وہ اپنے قلم سے چھوٹے چھوٹے لفظ لکھتا جاتا ہے اور کاغذ پر اس منظر کی پوری تصویر بننے لگتی ہے پھر وہ منظر قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے اور قاری حیرت کے ایک نئے جہان میں چلا جاتا ہے وہ لطف کی ایسی کیفیت ہے جہاں سے وہ خود بھی واپس نہیں آنا چاہتا۔

زعیم رشید

www.nazmina.com

ISBN 978-969-7633-10-8